طلوع اسلام

May-41

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا

ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتب
اخوندزادہ حسین امام

بدلِ اشتراک
سالانہ پانچ روپیہ 5/-
ششماہی تین روپے 3/-
فی پرچہ آٹھ آنے

جلد (۳) شمارہ (۵)

ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ مطابق مئی ۱۹۴۱ء

فہرستِ مضامین

۱۲ ربیع الاوّل کی یاد		۱
۱۲ ربیع الاوّل کی یاد میں		۲
شعرِ اقبالؒ	جناب اسد ملتانی	۳
لمعات	ادارہ	۴–۱۷
آنحضرتؐ کا بچپن	جناب علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری	۱۸–۲۲
بابُ المراسلات		۲۳–۲۴
سلیم کے نام ساتواں خط	جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۲۵–۳۵
حقائق و عبر	ادارہ	۳۶–۴۰
اقبال کا تصورِ خودی	جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب	۴۱–۵۸
نظامِ جدید	جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۵۹–۶۰
فیضانِ اقبال	جناب اسد ملتانی	۶۱–۸۱

۱۲ ربیع الاوّل کی یاد میں

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی — دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں صلعم کا — بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

۲۱ اپریل کی یاد میں

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

(حکیم الامت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ)

شعرِ اقبال

(جناب اسد نے یہ نظم ۱۲ اپریل کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈکاسٹ کی اور باخذ اجازت شایع کیجاتی ہے۔ طلوع اسلام)

شاعر اک نغمۂ رنگیں جو سنا دیتا ہے — جامِ مے کان کے رستے سے پلا دیتا ہے
عیش و آرام کے دامن میں دکھا کر راحت — روح کو جسم کی تربت میں سلا دیتا ہے
زندگی میں نہ رہے کچھ بھی حرارت باقی — اشکِ حسرت سے دلِ اس طرح بجھا دیتا ہے
ہے دمِ سرد تو کیا اور نفس گرم تو کیا — شعلۂ تند ہوس ہی کو ہوا دیتا ہے
کھیلتا ہے فقط ابھری ہوئی جذبات کیساتھ — انکی تیزی کو ذرا اور بڑھا دیتا ہے
اہلِ محفل کے خیالات کے لے کر پرتو — اپنے الفاظ کے پردے پہ سجا دیتا ہے

پھر عجب کیا ہے جو ٹھہرے یہ سخن کا معیار
شعر اچھا ہی وہی ہے جو مزا دیتا ہے

مختلف ہے مگر اقبال کا اندازِ سخن — شاعری کو وہ حقیقت سے ملا دیتا ہے
ذوقِ تفریح و تفنن سے اسے کر کے بلند — شعر کو لازمۂ زیست بنا دیتا ہے
ممکناتِ دلِ انساں کو نمایاں کر کے — اک نیا ولولۂ نشو و نما دیتا ہے
کچھ دبے رہتے ہیں جو فطرتِ حیوانی سے — ایسے جذبات میں اک حشر اٹھا دیتا ہے
ڈال کر سوزِ تمنا کی کوئی چنگاری — سرد سینے میں بھی اک آگ لگا دیتا ہے
دہر کے رنج و الم ہیچ نظر آتے ہیں — دل کو ایسا غمِ اندوہ ربا دیتا ہے
موت کا خوف ہی دل میں نہیں رہتا باقی — ایسے انداز سے پیغامِ بقا دیتا ہے
کر کے انسان میں احساسِ خودی کو بیدار — دل کی سوئی ہوئی قوت کو جگا دیتا ہے
فلسفے کو وہ بناتا ہے محبت کا غلام — عقل کو عشق کے رستے پہ لگا دیتا ہے

پیکرِ خاک کو دیتا ہے شعورِ انساں
اور پھر انساں کو مسلماں بنا دیتا ہے

(اسد ملتانی)

لمعات

مسلم لیگ کا اجلاس مدراس اپنے اندر اس اعتبار سے ایک نمایاں خصوصیت رکھتا ہے کہ اس میں لیگ کی کانسٹی ٹیوشن (دستور العمل) میں اس کا نصب العین واضح اور غیر مبہم الفاظ میں متعین کر دیا گیا ہے۔ اس سے پیشتر لیگ کا نصب العین یہ تھا کہ "ہندوستان میں مختلف جمہوری ریاستوں کے رفاق (CONFEDRATION) سے مکمل آزادی کا حصول"۔ اس قسم کی آزادی کا تصور ہندوستان میں وحدتی نظام حکومت کے اصول پر مبنی تھا۔ جسکی رُو سے مرکز میں مسلمان اقلیت غیر مسلم اکثریت کے ماتحت رہتی تھی۔ یہ آزادی در اصل ہندو راج کے مرادف تھی۔ جس کے خلاف لیگ اپنی نشاۃ ثانیہ سے لیکر اس وقت تک نبرد آزما ہے۔ سالِ گذشتہ لیگ نے پاکستان کا ریزولیوشن پاس کیا۔ لیکن ہنوز لیگ کے دستور اساسی میں تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ اب پاکستان کا نصب العین لیگ کے بنیادی قانون کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یعنی اب کوئی شخص لیگ کا ممبر نہیں ہو سکتا اور نہیں رہ سکتا تاوقتیکہ وہ پاکستان کے ریزولیشن کو تسلیم نہ کرے۔ اب بات بالکل واضح ہوگئی۔ اب لیگ نے اپنا نصب العین ذیل کے الفاظ میں متعین کر لیا۔

"مکمل آزاد ریاستوں کا استقرار۔ جو اس طرح متعین کی جائیں گی، کہ شمال مغرب اور شمال مشرق کے وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مسلمانوں کے ملّی نشیمن ہونگے۔ ان کی حکومت میں کسی غیر کا عمل دخل نہ ہوگا"

افسوس ہوا کہ عین اجلاس کے شروع میں مسٹر جناح کی طبیعت کچھ ایسی ناساز ہوگئی کہ وہ اس کے اثرات کی وجہ سے مجبوراً اجلاس کی روئیداد میں اس گرمجوشی اور جوان ہمتی سے حصّہ نہ لے سکے جو عزم و

صداقت کی بناء پر ان کے لئے فطرتِ ثانیہ سی بن چکی ہے۔ بایں ہمہ ان کا طویل و عریض فی البدیہہ خطبۂ صدارت ان تمام خصوصیات کا آئینہ دار ہے جن میں مسٹر جناح منفرد ہیں۔ اس کے جستہ جستہ اقتباسات سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگ سکے گا۔ آپ نے فرمایا۔

"یقین مانیئے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد مسلمان ایسے منظم، ایسے زندہ اور اس قدر بیدار کبھی نہیں ہوئے، جیسے آج ہیں۔ آج ہمارے سر پر ہمارا اپنا علم لہراتا ہے۔ یعنی ہندی مسلمانوں کا ملّی علم۔ ہم نے ایک ایسا پلیٹ فارم مستحکم کر لیا ہے جو تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی وحدت کا مظہر ہے۔ ہم نے نہایت واضح الفاظ میں متعین کر دیا ہے کہ ہمارا نصب العین **پاکستان** ہے...... ہم نے فی الواقعہ بڑی نمایاں ترقی کی ہے۔ اس اعتبار سے ہم نے انھیں (غیروں کی نگاہوں میں نہیں بلکہ) خود ان کی اپنی نگاہوں اور اپنی تصورات میں بھی عروج آشنا کر دیا ہے۔ وہ اب محسوس کرنے لگ گئے ہیں کہ ان میں خودی، خودداری اور خود اعتمادی پیدا ہو چکی ہے۔ انھیں احساس ہو چکا ہے کہ وہ ایک قوم کی حیثیت سے عزت و توقیر کے مالک بن گئے ہیں۔"

کارکن جماعت کے افراد کو مخاطب کرتے ہوئے آپ فرمایا۔

"آپ کے سامنے سب سے بڑا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس قسم کی تربیت کر دیں کہ وہ دنیائے سیاست میں الفاظ و جذبات و اعمال کے اعتبار سے نہ صرف اس ملک میں بلکہ ساری دنیا میں ممتاز ہو جائیں اور وہ اس قابل ہو جائیں کہ وہ ہر وقت ہر مشکل کا سامنا کرنے کیلئے آمادہ ہوں۔"

مسلم لیگ کے نصب العین کے متعلق فرمایا۔

"میں واضح ترین الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ کا نصب العین یہ ہے کہ ہم شمال مغرب اور شمال مشرق میں ایسی آزاد حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جن میں آخرالامر دفاع۔ امور خارجہ۔ ذرائع حمل و نقل۔ بحری محصول۔ کرنسی۔ مبادلہ وغیرہ کے تمام شعبے مکمل طور پر ہمارے اختیار میں ہوں۔ ہم کسی صورت میں بھی ایسے اندازِ حکومت کو

تسلیم نہیں کریں گے۔ جس میں تمام ہندوستان کا مرکز ایک ہو۔ ہم اسے کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ اگر تم نے کبھی اسے تسلیم کر لیا تو سُن رکھیئے کہ مسلمان اس ملک کی زمین سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں گے۔ جہاں تک ہمارے آزادیِ نشیمنوں کا تعلق ہے۔ ہم مرکز کے کسی وفاق سے وابستہ نہیں ہونگے۔ (ہمارا اپنا مرکز الگ ہوگا) ....

حکومتِ برطانیہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کبھی وحدتِ مرکز کی کسی اسکیم کو تسلیم نہیں کریں گے۔ حکومتِ برطانیہ کو اس کا بھی علم ہے کہ جمہوری اور پارلیمانی اندازِ حکومت، ہندوستان جیسے ملک میں فریب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ مسلمان کسی ایسی حکومت کے خلاف کبھی اعتراض نہیں کر سکتا۔ جس کی بنیاد نوعِ انسانی کی مساوات اور اخوت پر ہو۔ (لیکن مغربی جمہوری اندازِ حکومت کے تو معنی ہی کچھ اور ہیں) مغربی جمہوریت سے مفہوم یہ ہے کہ اکثریت۔ اقلیت پر حکومت کرے۔ ایک قوم اور ایک سوسائٹی میں ایسی حکومت کا مفہوم پھر بھی سمجھ میں آسکتا ہے، ایک ایسی قوم اور سوسائٹی میں جو ہر لحاظ سے وحدتِ خیال و عمل رکھتی ہو۔ نیابتی اندازِ حکومت بھی سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن جس ملک میں دو (بلکہ دو سے بھی زیادہ) الگ الگ مستقل قومیں آباد ہوں۔ اس ملک میں اس قسم کی حکومت کا قیام، ناقابلِ تصور شے ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ ان دونوں قوموں کا نظامِ معاشرت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

اور ان دو قوموں کا ہی نہیں بلکہ اس برِاعظم کے جنوب میں دراوڑی قوم اپنی جداگانہ ہستی رکھتی ہے۔ یہ خطۂ ملک دراصل دراوڑستان ہے۔ ذرا تصور میں لائیے کہ اس خطۂ ارض میں تین فیصدی براہمنوں نے کس طرح دستورِ انتخاب کا سیاسی جال بچھا رکھا ہے۔ تین فیصدی براہمنوں نے یہاں حکومت قائم کر رکھی ہے! کیا یہی جمہوریت ہے؟؟"

مسلم اکثریت کے علاقوں میں بسنے والی غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

" مجھے یقین ہے کہ جب وقت آئیگا تو ہمارے علاقوں میں بسنے والی اقلیتیں

دیکھ لیں گی۔ کہ ہم اپنی روایات۔ اپنے وراثتی اثرات اور اسلامی تعلیم کی بنا پر نہ ان کے ساتھ صرف عدل و انصاف روا رکھیں گے۔ بلکہ احسان و مروّت کا بھی سلوک کریں گے۔"

لیگ کے نصب العین کے اصول و مبانی کے متعلق تصریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"مسلم لیگ کا نصب العین اس بنیادی اصول پر قایم ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ اس لئے انھیں کسی دوسری قومیت میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملّی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش کی جائیگی اس کی سخت مخالفت کی جائے گی۔ اور میرا خیال تو یہ ہے کہ جو کوئی اس قسم کی کوشش کا ارادہ رکھیگا حماقت کرے گا۔ ہم نے تہیّہ کرلیا ہے کہ ہم اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کرکے رہیں گے۔"

کس قدر عظیم الشان ہے یہ عزم اور کتنے صاف اور واضح ہیں۔ وہ الفاظ جن میں یہ بیان کیا گیا ہے۔

حق گوئی و بے باکی آئینِ جوانمرداں
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی — اقبال رح

مسٹر جناح کے خطبہ میں ایک لفظ ایسا ہے جسکے متعلق امکان ہے کہ بعض حضرات غلط معنی پہنانے کی کوشش کریں۔ انھوں نے فرمایا کہ "لیگ کا نصب العین یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب شمال مشرق میں ایسی آزاد حکومتیں قایم کی جائیں جن میں آخرالامر (FINALLY) دفاع وغیرہ کے شعبے مکمل طور پر ہمارے ہاتھ میں ہوں۔" اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر جناح کے ذہن میں یہ ہے کہ سردست ہم ایسی حکومت کو بھی تسلیم کرلیں گے جسمیں تمام ہندوستان کے لئے ایک مرکز ہو اور رفتہ رفتہ اس مقام تک جا پہونچیں گے کہ ہمارا اپنا مرکز الگ ہو۔ یہ امکانی مفہوم غلط ہے۔ اس لئے کہ مسٹر جناح نے اپنے اسی خطبہ میں باربار اس امر کی تصریح فرمادی ہے کہ ہم کسی صورت میں بھی کسی ایسے دستورالعمل کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ جس میں وحدتِ مرکز کا شائبہ ہو۔ اقتباساتِ بالا کو ایک مرتبہ پھر ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے

کہ مسٹر جناح ایسے انداز حکومت کی کس قدر شد و مد سے مخالفت کرتے ہیں۔ اُنھوں نے بالتصریح فرما دیا ہے کہ اگر مسلمانوں نے کبھی اس انداز حکومت کو تسلیم کر لیا تو وہ سمجھ لیں کہ یہ ان کی پُلی موت کے مرادف ہوگا۔ ان تصریحات کی روشنی میں یہ خیال کرنا کہ مسٹر جناح وحدتِ مرکز کے انداز حکومت کو شروع شروع میں تسلیم کر لینگے۔ خوش فہمی یا خود فریبی سے زیادہ نہیں۔ مسٹر جناح نے ایسے غیر مبہم الفاظ میں اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ اس کے متعلق کسی تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ (FINALLY) سے ان کا مقصد صرف اس قدر ہے جو اُنھوں نے گذشتہ اسمبلی میں ۲۹ - ۳/۴۱ - اپنی تقریر میں بیان فرمایا تھا۔ مسٹر ایمنے کے ایک اعتراض کے جواب میں اُنھوں نے فرمایا۔

"ہماری پوزیشن یہ ہے۔ ہم ہندوستان کے مسئلہ کو دو شقوں میں تقسیم کرتے ہیں حال اور مستقبل۔ جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے ہم کہتے ہیں کہ جب کانسٹی ٹیوشن (دستورِ اساسی) کے بتمام و کمال بدلنے کا وقت آئیگا تو ہم مختلف اسکیموں پر غور کریں گے ہمارا عقیدہ **پاکستان** ہے۔ جہاں تک حال کا تعلق ہے ہماری پوزیشن یہ ہے کہ ہم جنگ کے مسئلہ کو کامیابی سے حل کرنے کے لئے موجودہ کانسٹی ٹیوشن کے اندر حکومت وضع کرنے میں تعاون کے لئے تیار ہیں اس وقت حکومت کے ساتھ ہماری لڑائی صرف اس قدر ہے کہ مرکز اور صوبوں کی حکومت میں مسلم لیگ کو معتد بہ حصہ نہیں دیا جا رہا۔"

مسٹر جناح نے جہاں آخرالامر (FINALLY) کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ مستقبل میں جب موجودہ کانسٹی ٹیوشن کو قاطبۃً بدل کر اسکی جگہ جدید کانسٹی ٹیوشن لانے کا سوال ہوگا۔ اس وقت مسلم لیگ الگ مرکز کے انداز حکومت کا مطالبہ کریگی۔ اُسی کا نام باصطلاح موجودہ پاکستان ہے۔

یہ ہے لیگ کا نصب العین۔ ہمیں سردست ان جھگڑوں میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں کہ یہ نصب العین دستور و ضوابط (CONSTITUTION) کی تبدیلیوں سے کس طرح حاصل ہوگا؟ اسے

کون قبول کرے گا۔ وغیرہ۔ لیگ کا یہ نصب العین ہے اور نصب العین اسلامی معیار کے مطابق ہے۔ مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کی آزاد حکومتیں۔ اور جب مسلمانوں کی آزاد حکومتیں قائم ہونگی تو انہیں سے آزاد اسلامی حکومتیں قیام میں آئینگی۔ جب تک مسلمانوں کی آزاد حکومت نصیب نہ ہوگی۔ اسلامی حکومت (جسے ہم قرآنی حکومت یا حکومت خداوندی کہتے ہیں) کس طرح قائم ہو سکے گی۔ ہذا لیگ کا نصب العین ایسا ہے جس سے کسی مسلمان کو مجالِ انکار نہیں ہو سکتا اور اب چونکہ یہ نصب العین لیگ کے دستور اساسی میں داخل ہو چکا ہے۔ اس لئے اب کسی خلط مبحث کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ اب یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص لیگ کی رکنیت کا بھی مدعی ہو اور پاکستان کی مخالفت بھی کرتا ہے۔ اب تو اسے ایک طرف ہونا پڑے گا۔ اسی وضاحتِ نصب العین کا نتیجہ ہے کہ غیر مسلم حلقوں میں بھی یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ جو شخص پاکستان کا حامی نہیں وہ لیگ کے ساتھ کس طرح رہ سکتا ہے؟ حال ہی میں بھائی پرمانند نے اپنی ایک اپیل کے دوران میں لکھا ہے۔

> " پاکستان کسی کو بھی اپیل نہیں کرتا حتیٰ کہ خود لیگ کے اندر اس مسئلہ پر پہلے ہی سے اختلاف پیدا ہو چکا ہے۔ یہ ایک خوش کن علامت تھی کہ وزیر اعظم پنجاب نے نہایت واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ پنجاب میں کوئی فرقہ وارانہ حکومت قائم نہیں ہو سکتی "
>
> (اسٹیٹسمین ۲۱ اگست)

جیسا کہ ہم گذشتہ اشاعت کے لمعات میں لکھ چکے ہیں۔ یہ چیز ملتِ اسلامیہ کے لئے انتہائی بدبختی اور ہمارے لئے نہایت جاں گسل ہوگی۔ اگر آج لیگ کے ارباب حل و عقد کے اندر مسئلہ پاکستان کے متعلق کسی قسم کا اختلاف رونما ہو گیا۔ جیسا کہ مسٹر جناح نے فرمایا۔ یہ واقعہ ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد یہ پہلا موقعہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک واضح نصب العین کے ماتحت ایک مرکز پر جمع ہونے شروع ہوئے ہیں۔ لہٰذا آج کوئی ایسا اقدام جو ان کے اندر تشتت و افتراق کا موجب ہو۔ جو ان کی وحدت میں رخنہ اندازی کرے۔ جو ان کی ایک جہتی و ہم آہنگی میں چھوٹے سے چھوٹا اختلاف پیدا کر دے۔ جرمِ عظیم ہوگا۔ ہماری انتہائی شوربدہ بختی ہے کہ اس باب میں تمام طول و عرض ہند میں ایک اور صرف ایک نام

ایسا لیا جاتا ہے۔ جسے پیش کر کے اس دعویٰ کا ثبوت پیش کیا جا رہا ہے کہ لیگ کے حلقۂ بست و کشاد میں اس مسئلہ پر اختلاف ہے۔ جب یہ نام غیروں کی طرف سے آگے بڑھایا جاتا ہے تو ہماری نگاہیں فرطِ ندامت سے جھک جاتی ہیں۔ کلیجہ میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے جو بیساختہ یہ دعا بن کر زبان تک آجاتی ہے کہ اے اللہ! تو نے جہاں اپنی رحمتِ عامہ کے صدقے اس مُردوں کی بستی میں پھر سے جان ڈالدی ہے یہ کیا بعید ہے کہ ہمارے اس ایک بھائی کے دل میں وہ قوتِ ایمانی پیدا کر دے کہ جس سے یہ نظر فریب مقاصد و مصالح کے عنکبوتی تاروں کو جھٹک کر بے باکانہ قافلۂ ملّت کے ساتھ ہو جائے جس سے ہم انہی غیروں کو جو آج یوں طعنہ زنی کرتے ہیں۔ برملا کہہ سکیں کہ

دیدهٔ آغازم ۔ انجامم نگر!

لیکن اگر ہماری ان معصوم آرزوؤں کے باوجود ایسا نہ ہو تو بہر حال مجبوری ہے۔ ہمیں افسوس ضرور ہوگا۔ لیکن اللہ کے کام افراد کی وجہ سے رُکا نہیں کرتے۔ لیگ، کا نصب العین حق و صداقت کے پیام کا علمبردار ہے۔ اس لئے افراد کی مخالفت اس کا کچھ بگاڑ نہیں کر سکے گی۔ سالِ گذشتہ لیگ کا سالانہ اجتماع ان تمام سوانح و حوادث کے باوجود۔ جن کا تذکرہ سابقہ اشاعت میں دہرایا جا چکا ہے۔ نہایت کامیاب رہا۔ امسال پنجاب کے ایک خاص حلقہ نے کھلا ہوا عدمِ تعاون کیا۔ لیکن بایں ہمہ مدراس کا اجتماع بھی عدیم النظیر رہا۔ اس لئے اب یہ حقیقت روز بروز روشن سے روشن تر ہوتی جا رہی ہے کہ جس چراغ کے ساتھ تائیدِ ایزدی شامل ہو وہ پھونکوں سے بجھایا نہیں جا سکتا۔

امسال بنگال کی طرف سے بھی مندوبین کی تعداد کچھ کم رہی۔ لیکن پنجاب اور بنگال میں بہت بڑا فرق ہے۔ جریدۂ اسٹیٹسمین کے "شاہدِ عادل" جنھوں نے اس کفرستان کے ایک گوشہ میں **دارالاسلام** کا نقشہ مرتب کر رکھا ہے۔ اس باب میں رقمطراز ہیں۔

"بنگال میں فرقہ وارانہ فساد کی وجہ سے اجتماعِ مدراس میں شامل ہونے والے مندوبین کی تعداد کچھ کم رہی اس بناء پر مسٹر فضل الحق بھی شریکِ اجلاس نہ ہو سکے۔ لیکن انھوں نے ایک پیغام بھیجا جس میں پاکستان کی مکمل تائید کی تھی۔ وقتاً فوقتاً ایک خاص

حلقہ کی طرف سے اس قسم کی افواہیں پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے مترشح ہو کہ مسٹر فضل الحق کا ارادہ ہے کہ وہ لیگ سے الگ ہو جائیں۔ لیکن یہ بات، پورے اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ اس باب میں۔ اور اسی طرح کی دوسری باتوں میں بنگال کے وزیر اعظم کی طرف غلط چیزیں منسوب کی جاتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ سر سکندر حیات خاں صاحب کے متعلق بھی ایسا ہی کہا جاسکے (لیگ کے اجلاس سے) ان کی غیر حاضری کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اسکے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض کانگریسی لیڈر۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کیلئے سر سکندر کی طرف آنکھیں لگائے بیٹھے ہیں۔ ان چیزوں کی وجہ سے ان اشتباہات کا دور کرنا آسان نہیں جو سر سکندر کے متعلق پہلے ہی مسلمانوں کے دل میں پیدا ہو چکے ہیں۔

اب جو لیگ نے پاکستان کو اپنا واضح نصب العین متعین کر لیا ہے۔ سر سکندر کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ اپنی پوزیشن کو بھی واضح کر دیں۔ آج لیگ اور کسی نمایاں مسلمان میں اختلاف مسلمانان ہند کے لئے باعث تاسف ضرور ہوگا۔ لیکن اب لیگ کو وہ پوزیشن حاصل ہو چکی ہے۔ جس کے مقابلہ میں انفرادی شخصیتوں کا خیال کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔"

(اسٹیٹسمین ۱۹؎)

(۲)

جس چیز کا ایک مدت سے کھٹکا تھا۔ بالآخر اس کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس کبر سنی کے عالم میں مسٹر جناح گذشتہ تین چار سال سے جس جذب، وانہماک اور جس سعی و کاوش سے مصروف کار ہیں اسکے پیش نظر خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی صحت پر برا اثر نہ پڑ جائے۔ یہ تو محض اللہ کا فضل ہے کہ اس منحنی سے نحیف و نزار جسم میں ایسی بجلیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ ورنہ جن حالات کے ماتحت مسٹر جناح اس قدر ان تھک کام کر رہے ہیں اس کی ان سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ایک دنیا سے مقابلہ۔ حالات ایسے نامساعد۔ رفقائے کار کی کمی۔ غیروں کی منظم قوتوں کی مدافعت۔ اور ستم بالائے ستم کہ خود اپنوں کی طرف سے دل گرفتگی اس قدر کثرت مشاغل اور ہجوم مشکلات اور ان کے اندر گھری ہوئی ایک ننھی سی جان ناتواں۔ اللہ کی تائید نہیں تو اور کیا ہے۔ جو اُسے ان سب پر غالب کئے جا رہی ہے لیکن جسم بالآخر ایک مشینری ہے۔ کثرت کار

اور ہجوم افکار اعصابی تاروں کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ مدراس سے پچھلے دنوں جو اطلاعات موصول ہوتی رہی ہیں۔ وہ بڑی متوحش کن ہیں۔ بگڑی ہوئی صحت عام حالت میں ہی بمشکل سنبھلا کرتی ہے۔ لیکن جب مشاغل و افکار کی کثرت کا وہی عالم ہے۔ تو صحت پر اور بھی برا اثر پڑتا ہے۔ مسلمانوں کو ابھی صحیح اندازہ نہیں کہ مسٹر جناح کی زندگی کس قدر گراں بہا ہے اس کا اندازہ آنے والی نسلیں ہی کر سکیں گی۔ بہرکیف آج ضرورت اس امر کی ہے کہ جس سے جس قدر ہو سکے ان کی راہ میں آسانیاں پیدا کرے جس سے اُن کی صحت قائم رہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ بخلوص قلب سے دعائیں کی جائیں کہ اللہ تعالیٰ ملّتِ اسلامیہ کے اس محسنِ عظیم کو صحت اور زندگی عطا فرمائے کہ اس وقت تو ملّت جناح کی ذات میں ہی سمو ئی ہوئی ہے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

---

(۳)

بلبل حریت علامہ مشرقی کی ناسازیٔ طبع کی وحشت انگیز خبریں ایک عرصہ سے موصول ہو رہی تھیں۔ شروع اپریل میں ان خبروں نے زیادہ نازک شکل اختیار کرلی اور میاں شاہدین صاحب کے ایک تار سے معلوم ہوا کہ علامہ صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی جارہی ہے۔ اس کے بعد تفصیلات کا علم نہیں ہوسکا۔ میاں صاحب جناب علامہ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے انہوں نے ان سے ملاقات کی یا نہیں۔ اور اگر ملاقات کی ہے تو ان کی صحت کے متعلق صحیح صحیح اطلاع کیا ہے۔ اس کے متعلق ان کا کوئی بیان ہماری نگاہ سے نہیں گذرا جس سے ہماری تشویش اور بھی بڑھ گئی ہے۔

جیسا ہم نے مسٹر جناح کی نسبت لکھا ہے۔ اس سے زیادہ علامہ مشرقی کے متعلق لکھنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کو فی الواقعہ معلوم ہی نہیں کہ مشرقی کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کا مسلمان بیچارا ہے بھی معذور۔ اسے کیا معلوم کہ زندگی کسے کہتے ہیں اور اس کی قیمت کیا ہے؟ کوّے نے الماس کے چمکتے ہوئے ریزے پہ چونچ ماری اور بڑے حقارت آمیز لہجہ میں کہنے لگا کہ اونہہ! میرے تئے تجھ سا شبنم کا قطرہ ہی بہرحال اس وقت ہم اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتے کہ مشرقی کیا ہے اور اسے کونسی نگاہیں پہچان سکتی ہیں۔ اس وقت صرف اتنی سی قدر مشترک کو لیجیے کہ وہ ایک مسلمان ہے (اور اگر بفرض محال وہ اس کی بھی جانے

نہ دے تو اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ ایک انسان ہے) جس کا گھٹ گھٹ کر دم نکل رہا ہے۔ کیا آپ کے دل میں احترام انسانیت کیلئے تھوڑی سی بھی گنجائش نہیں کہ اس کے منہ میں پانی کے چند قطرات ٹپکائے جائیں۔ آج **مشرقی** کی جگہ ہندو قوم کا کوئی ادنےٰ سا فرد بھی قید و بند کی ان جاں گسل مصیبتوں میں مبتلا ہو کر خرابی صحت کا شکار ہو جاتا تو آپ دیکھتے کہ ملک کے طول و عرض میں کیا قیامت برپا ہو جاتی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ ہنگامہ خیزیاں کیجئے ہم یہ نہیں چاہتے کہ آپ فساد برپا کیجئے۔ لیکن ایک انسانی زندگی کو بچانے کے لیئے کسی ہمدردی کے جذبہ کا اظہار تو کوئی جرم نہیں۔ کیا آپ سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ حکومت سے درخواست کی جائے کہ **علامہ مشرقی** کو اگر رہا نہیں کیا جا سکتا تو کم از کم انھیں شمالی ہند کے کسی اچھے مقام کے جیل میں منتقل کر دیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان کی حالت کچھ عجیب سی ہو رہی ہے۔ مرزا غالبؔ نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ ہجوم مصائب سے اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر رکھا ہے۔ جب مجھ پر کوئی تازہ مصیبت آتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اچھا ہوا غالب کے ایک اور چپت لگی! یہی حالت آج مسلمان کی ہو رہی ہے اس کے کسی بھائی پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہوا کہ اس کے اور چپت لگی اور نہیں سمجھتا کہ

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

وہ مسلمان جس کے متعلق مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ ان کی مثال ایک جسد واحد کی سی ہے کہ پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا لگ جائے تو آنکھ کے آبگینے میں آنسو جھلک آئیں۔ آج اس مسلمان کی یہ حالت ہے کہ دائیں آنکھ میں آشوب ہوتا ہے تو بائیں آنکھ یہ سمجھ کر اطمینان کی نیند سو جاتی ہے کہ مجھے اس آشوب سے کیا تعلق؟ اگر "خوگرِ حمد کو تھوڑے سے گلہ" سے معاف رکھا جائے تو ہم اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس باب میں مسلم لیگ نے بڑی افسوسناک تغافل شعاری سے کام لیا ہے۔ لیگ اور خاکسار دلوں میں اگر کوئی اختلاف تھا تو اسے بھی چھوڑیئے مشرقی کے خلاف اگر آپ کو کچھ شکایت تھی تو اس سے بھی قطع نظر کیجئے۔ آج نہ ان اختلافات کو دہرانے کا موقع ہے نہ ان شکایات کو درمیان میں لانے کا وقت مسلم لیگ مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کی ذمہ دار جماعت ہے۔ مشرقی بھی بالآخر انہی میں سے ایک ہے۔

(کیونکہ کم از کم لیگ نے اسپر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا) کیا لیگ پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ اس کی صحت کی بحالی کے لئے کوئی چارہ جوئی کرے۔ کیا اس باب میں وہ اس انتظار میں ہے کہ خاکساروں کی طرف سے اُنھیں وکالت نامہ مل جائے تو پھر کوئی اور قدم آگے بڑھایا جائے۔ لیگ تمام مسلمانوں کی وکیل ہے۔ اُسے کسی کی طرف سے وکالت نامہ کی کیا ضرورت ہے۔ اور پھر اس خاص مسئلہ میں تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ایک مسلمان مصیبت میں مبتلا ہے۔ ہر مسلمان پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اس مصیبت میں اس کی مدد کرے ہمیں توقع ہے کہ لیگ اب مزید توقف کے بغیر اپنی توجہات کو اس مسئلہ پر مرکوز کردیگی۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو ہماری اس آواز میں مزید تقویت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ بھی لیگ کی توجہ اس طرف منعطف کرائیے۔ یقین مانئیے کہ آپ کی یہ کوشش ایک نمایاں نتیجہ اور بہت بڑے اجر کا موجب ہوگی۔ قرآن کو سمجھنے والے روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے۔

---

(۴)

یوں تو مسلمانوں میں قحط الرجال کا ہر وقت رونا ہے۔ مگر کسی اہم تقریب پر یہ حدیثِ الم اُبھر کر سطح پر آجاتی ہے اور جب سے ہندوستان میں ریڈیو کا عام چرچا ہوا ہے ایسے مواقع پر اس کمی کا احساس اور بھی زیادہ جانگداز ہوجاتا ہے۔ اپریل میں دو اہم تقاریب سامنے آئیں۔ اوّل وہ تقریبِ سعید و اطہر جس کی یاد ہر مسلمان کے لئے باعثِ آسودگیٔ رُوح اور وجہ تازگیٔ ایمان ہے۔ یعنی اس ذاتِ اقدس واعظم کے ظہور کی تقریب جس نے انسان کو شرفِ انسانیت سے روشناس کرایا۔ وہ ذاتِ گرامی مرتبت جس میں جلال و جمال کی تمام خوبیاں اپنے معراجِ کمال تک پہونچ گئیں۔ اور جس کے سنگِ آستاں پر معراج و مراتب کی تمام بلندیاں سجدہ ریز ہوگئیں۔ وہ نوعِ انسانی کا مصلحِ اعظم جس نے اپنی حقیقت کشا تعلیم، اور فقید المثال عمل سے اس دنیا پر خدا کی حکومت کا تخت بچھایا۔ جس میں انسان غلامی کی لعنتوں سے چھوٹ کر حقیقی آزادی کے ثمرات سے لذت آشنا ہوا۔ یہ تقریب اسی ذاتِ ختمی مرتبت کے ظہور بعثت کی تھی۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝

دوسری تقریب اسی شمع نبوّت کے پروانہ۔ اسی پیغامِ حقیقت کے مبلغ حکیم الاُمّت حضرت علامہ اقبال کی وفات کی تیسری برسی تھی۔

ظاہر ہے کہ ایک زندہ قوم کے لئے ان تقاریب کے منانے کا کیا اسلوب و انداز ہونا چاہیئے۔ آجکل ریڈیو قوموں کی زبان بن چکا ہے اور ایسی زبان کہ جسکی آواز زمین کے دور دراز گوشوں تک پہنچ سکتی ہے۔ ریڈیو والوں نے ان ہر دو تقاریب پر خاص پروگرام نشر کئے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے کہ ہماری طرح اور لاکھوں مسلمانوں کو مہینوں سے اس پروگرام کا انتظار تھا۔ لیکن یہ پروگرام جس درجہ مایوس کن تھے اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں جنھوں نے اس قدر کاوش و انتظار و وفورِ شوق کے بعد انھیں سُنا ہے۔ حیرت ہے کہ یا تو ہندوستان کے مسلمان اس قدر تہی داماں ہو چکے ہیں۔ یا محکمۂ ریڈیو کے اربابِ حل و عقد کا انتخاب ہی کچھ ایسا ہے۔ وجہ کوئی بھی ہو۔ نتیجہ ایک ہی ہے کہ وہ پروگرام جن سے توقع کی جا سکتی ہے کہ سننے والوں کے قلب و دماغ میں بجلیاں بن کر دوڑ جائیں گے اور ان کی رگوں میں تازہ خونِ زندگی پھر پیدا کر دیں گے۔ یا تو طاؤس و رُباب کے خواب آور نغمات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور یا رسوم و مظاہر کے بے جان پیکر کام کی چیز کبھی کبھی سامنے آتی ہے۔ اسلام وہ نویدِ حیات ہے جسکے لئے آج ساری دُنیا مضطرب و بیتاب ہے۔ نبی اکرمؐ کے نقوشِ قدم کا ایک ایک ذرّہ وہ شمع درخشاں ہے جو ہر راہرو جادۂ ہستی کے لئے خضرِ طریقت بن سکتی ہے۔ حضرت علامہ کا پیغام ایک ایسی زندہ حقیقت ہے جس کی تلاش میں آج دنیا ماری ماری پھر رہی ہے۔ یہ سب کچھ موجود ہے۔ لیکن جو کچھ دُنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے وہ بالعموم ایسا بے جان اور افسردہ۔ ایسا بے کیف اور پژمردہ ہوتا ہے کہ اپنے اندر کوئی کشش و جاذبیت نہیں رکھتا۔ ہم محکمۂ ریڈیو سے گذارش کریں گے کہ وہ یا تو ان تقاریب پر کچھ بھی نشر نہ کیا کریں۔ اور اگر وہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں تو پھر وہ کچھ نشر کیا کریں جو اسلام کی آواز کہلا سکے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اربابِ علم و فضل پر مشتمل ایک نمایندہ مجلس متعین کی جائے اور پورے کا پورا پروگرام اس مجلس کے سپرد کر دیا جائے۔ اسی قسم کی سادہ تجاویز ہیں جو ہم نے ایک عرصہ سے محکمۂ ریڈیو کے پاس بھیج رکھی ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کے متعلق کوئی فیصلہ کن جواب نہیں ملا۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ ہم اس سے

پیشتر بھی اس امر کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ ہم اسلامی پروگرام کے متعلق محکمۂ ریڈیو سے خط وکتابت کر رہے ہیں۔ آخری چٹھی دسمبر میں بھیجی گئی تھی۔ باوجود کئی ایک یاددہانیوں کے وہاں سے کوئی جواب ہی نہیں ملتا یہ ٹھیک ہے۔

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

ہم گدائے گوشہ نشیں" کیا جانیں کہ "قطرے کو گہر" بننے تک کن صبر آزما مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس افسوسناک صورت حالات کے ذمہ دار محکمۂ ریڈیو سے کہیں زیادہ خود مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کی پست ہمتی کا یہ عالم ہو چکا ہے۔ کہ ریڈیو کے پاس بیٹھے ناک بھوں چڑھا رہے ہوں گے۔ لیکن حرام جو کسی میں اتنی عملی قوت ہو کہ چار سطریں لکھ کر محکمہ والوں کے پاس بھیجدے، کہ فلاں شئی ناقص تھی۔ ریڈیو والوں کو کیسے معلوم ہوگا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ اُن کے مقیاس و معیار تو آپ حضرات کی تنقیدات ہی ہیں۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ خود انہیں بتایئے کہ کس قسم کے پروگرام صحیح پیمانے پورے اُترتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ابھی تک ریڈیو کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں کیا حالانکہ ریڈیو آج دُنیا میں انقلاب برپا کر رہا ہے۔

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی
تم کو لیکن ذرا خبر نہ ہوئی

ہم علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ اگر آج کسی آزاد ریڈیو کے کمرے میں ایسا مردِ مومن بیٹھا ہو جس کے ہاتھ میں قرآن ہو تو وہ ساری دُنیا کی مشکلات کا حل پیش کر سکتا ہے۔ علم اگر دین کے تابع ہو جائے تو یہی جہنم جنت بن جائے

(—— ۵ ——)

کچھ عجیب اتفاق ہے کہ معارف القرآن کی اشاعت کے متعلق جس قدر جلدی کی جا رہی ہے۔ اسی قدر موانع حائل ہو رہے ہیں۔ کتاب ۲۲×۲۹/۸ کی بڑی تقطیع پر لکھی جا رہی ہے اور قریب پانسو

صفحات کی کتابت ہو چکی ہے۔ اب کتاب پریس میں دی جا سکتی تھی۔ لیکن جنگ کی وجہ سے کاغذ کی مشکلات اس قدر بڑھ گئی ہیں۔ جس کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنہیں طباعت کے کام سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہی نہیں کہ کاغذ کی قیمت دُگنی تگنی چڑھ گئی ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ کام کا کاغذ کمیاب بلکہ نایاب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جس قسم کا کاغذ معارف القرآن کے لئے مطلوب ہے۔ دلی بھر میں دستیاب نہیں ہو رہا۔ اب باہر تلاش کی جا رہی ہے۔ کاغذ مل جانے کے بعد طباعت میں زیادہ وقت نہیں لگیگا احباب کی بیتابی کا ہمیں اندازہ ہے۔ لیکن فرداً فرداً ہر ایک کے استفسارات کا جواب ناممکن۔ ہم کوشش کرتے ہیں۔ آپ دُعا کیجئے۔ یوں انتظار کی کاوش کم ہو جائیگی۔ السعی منی والاتمام من اللہ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

کچھ معاملہ کی باتیں

(۱) کاغذ کی مشکلات خود طلوع اسلام کے اشاعت میں بھی پیش آرہی ہیں۔ اگرچہ ابھی تک وہی کاغذ لگایا جا رہا ہے جو جنگ سے پیشتر لگایا جاتا تھا۔ لیکن ہم نہیں کہہ سکتے کہ کس وقت یہ کاغذ بھی کمیاب ہو جائے اور ہمیں کاغذ میں مجبوراً تبدیلی کرنی پڑ جائے۔ اس لئے ایسے میں اگر آپ کے ذوقِ سلیم کو کچھ ٹھیس بھی لگے تو ہماری مشکلات کے پیشِ نظر ہمیں معذور سمجھا جائے۔

(۲) طلوع اسلام کا آغاز مئی ۱۹۳۸ء سے ہوا تھا۔ اس لئے حلقۂ احباب میں اکثریت ان کی ہے جن کا سالانہ چندہ اپریل میں ختم ہو جاتا ہے۔ اپریل کے پرچہ میں حسبِ معمول اطلاعی کارڈ رکھدیئے گئے تھے۔ اب زیرِ نظر پرچہ میں یاددہانی کا پرچہ ملفوف ہے۔ اسے ضرور ملاحظہ فرمائیے۔

(۳) وی۔پی صرف ان حضرات کو بھیجا جاتا ہے جو خود وی۔پی طلب فرماتے ہیں۔ یا اُن کی طرف سے کوئی ذمہ وار دوست تحریر فرماتے ہیں۔ اس کے بعد جب کوئی وی۔پی واپس آجائے تو ہمارے احساسات کا خود ہی اندازہ فرمائیے۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

آنحضرت کا بچپن

(علامہ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کی تقریر جو آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی سے ۱۰ اپریل کو نشر کی گئی اور جسے باجازت محکمہ مذکور شائع کیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام)

عرب کے شہر مکہ کے سب سے بڑے سردار عبدالمطلب تھے جن کے دس نامور بیٹے تھے۔ ایک بیٹے کا نام عبداللہ تھا۔ عبدالمطلب نے ان کا نکاح حضرت آمنہ کے ساتھ کیا جو قریش کے قبیلہ کی ایک شاخ بنی زہرہ کی عزیز ترین بیٹی تھیں۔ نکاح کے تھوڑے دنوں بعد حضرت عبداللہ نے تجارت کی غرض سے مکہ سے ملک شام کا سفر کیا راستے میں مدینہ میں جہاں ان کا ننھیال تھا بیمار ہو کر ٹھہر گئے اور وہیں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے چند مہینوں کے بعد دوشنبہ کے دن صبح کے وقت ۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل سنہ ۵۷۱ء میں حضرت آمنہ کے شکم سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ یہ وہی سال تھا جس میں یمن کے بادشاہ ابرہہ نے ہاتھی لے کر خانہ کعبہ کو ڈھانے کے لئے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔ اور اللہ تعالےٰ نے اس کے ہاتھی اور اس کی فوج کے بڑے حصہ کو عذاب سے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

حضرت عبدالمطلب اپنے اس پوتے کی پیدائش کی خبر سنکر بہت خوش ہوئے۔ عرب کی رسم کے مطابق ساتویں دن ختنہ کیا اور محمدؐ نام رکھا۔ یہ نام نیا تھا۔ عربی قبیلوں کے نسب ناموں کے دیکھنے سے سوائے بنی تمیم کے ایک سردار کے اس نام کا اور کوئی آدمی سارے عرب میں اس سے پہلے نہیں ملتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے ان کی والدہ نے دودھ پلایا۔ پھر ثوبیہ دودھ پلانے لگیں جو آپ کے چچا ابولہب کی لونڈی تھیں۔ اس زمانہ میں مکہ کے سرداروں میں یہ دستور تھا کہ وہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو دیہاتی اور بادیہ نشین قبیلوں کی عورتوں کو دودھ پلانے اور پرورش کرنے کے لئے سپرد کر دیتے تھے۔ تاکہ ان کے بچے بدوی گھرانوں اور کھلے بیابانوں میں پل کر توانا اور تندرست ہوں اور عرب کی خصوصیات اور خصلتیں ان میں محفوظ رہیں اور فصیح عربی زبان سیکھیں۔ اس دستور کی وجہ سے ہر سال دو مرتبہ مکہ میں اردگرد کے دیہاتی قبیلوں کی عورتیں آیا کرتی تھیں۔ اور قریش رؤسا اپنے بچوں کو ان کے حوالہ کر دیتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے کچھ دنوں کے بعد قبیلہ بنی سعد کی کچھ عورتیں بچوں کی تلاش میں مکہ میں آئیں ۔ ان میں ایک عورت حلیمہ سعدیہ بھی تھیں ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے ان کو اپنا بچہ دینا چاہا مگر انہوں نے اس خیال سے کہ یتیم بچہ کی پرورش میں مجھ کو کیا ملے گا قبول نہ کیا ۔ اتفاقاً ان کو کوئی دوسرا بچہ مل نہ سکا اور خالی ہاتھ جانا بھی مناسب نہ سمجھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے لیا ۔ گھر پہنچ کر ان کو اپنی ہر چیز میں برکت نظر آنے لگی ۔ اس لئے اس بچہ کی بہت قدر اور محبت کرنے لگیں ۔ ان کی ایک بیٹی کا نام شیما تھا ۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت انس تھا اور وہی آپ کو کھلایا کرتی تھیں ۔ دو سال کے بعد حلیمہ نے جب دودھ چھڑایا تو آپ کو مکہ میں لائیں ۔ مگر اس زمانہ میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی اس وجہ سے آنحضرت کی والدہ نے فرمایا کہ ابھی واپس لیجاؤ ۔ حلیمہ نہایت خوش ہو کر پھر آپ کو گھر لائیں اور چوتھے سال مکہ میں لیجا کر آپ کی والدہ کے سپرد کیا ۔ اس طرح پر تقریباً چھ سال آپ کی پرورش قبیلہ بنی سعد میں حلیمہ سعدیہ کے گھر میں ہوئی ۔

بنی سعد کا قبیلہ فصاحت میں مشہور تھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسالت کے زمانہ میں فرمایا کرتے تھے کہ میں تم سب سے اچھی عربی بولتا ہوں کیونکہ ایک تو میں قریشی ہوں دوسرے میری زبان بنی سعد کی زبان ہے ۔ حلیمہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبت تھی ۔ نبی ہونے کے بعد جب وہ مکہ میں آئیں تو آپ میری ماں میری ماں کہکر ان سے لپٹ گئے ۔ اور چالیس بکریاں اور اونٹ عطا کئے ۔ حضرت حلیمہ بھی اسلام لائیں اور ان کے شوہر حارث بھی مسلمان ہوئے ۔ حضرت حلیمہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کے زمانہ تک زندہ رہیں ۔ وہ بھی ان کے ساتھ وہی مہربانی اور سلوک کرتے تھے جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا تھا ۔

جنگ اوطاس میں جب بنی سعد کے لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوئے تو ان میں حضرت حلیمہ کی بیٹی شیما بھی تھیں ۔ انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ میں تمہارے رسول کی بہن ہوں ۔ لوگ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے ۔ شیما نے اپنی پیٹھ پر ایک نشان دکھلایا اور کہا کہ ایک بار میں بچپن میں آپ کو کھلا رہی تھی آپ نے دانتوں سے کاٹ لیا تھا ۔ حضور کی آنکھوں میں محبت کی وجہ سے آنسو بھر آئے ۔ ان کے بیٹھنے کے لئے خود اپنی چادر بچھائی اور دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ پھر اونٹ اور بکریاں دے کر عزت و آرام کے ساتھ ان کو ان کے گھر پہنچا دیا ۔ شیما بھی اور ان کے بھائی عبداللہ دونوں اسلام لائے ۔

حضرت ثوبیہ جو ابولہب کی لونڈی تھیں اور جنہوں نے آپ کو چند روز دودھ پلایا تھا ان کے لئے ہر سال مدینہ سے انعام اور جوڑا بھیجتے تھے ۔ جب وہ انتقال کر گئیں تو دریافت فرمایا کہ ان کا کوئی وارث ہے معلوم ہوا کہ نہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کبھی کبھی مکہ سے مدینہ کو اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کو تشریف لیجایا کرتی تھیں۔ جب آنحضرت حلیمہ کے یہاں سے آگئے تو ان کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔ حضرت عبدالمطلب بھی ہمراہ تھے۔ مدینہ میں وہ بیمار ہوگئیں۔ اور واپسی کے وقت مقام ابواء میں پہونچکر انتقال ہوگیا۔ اور وہیں دفن کی گئیں۔ حضرت عبدالمطلب پوتے کو لیکر مکہ واپس آئے۔ اس سفر میں حضرت ام ایمن بھی ساتھ تھیں جو آنحضرت کی دایہ تھیں۔

آنحضرت کی عمر اس وقت چھ سال کی تھی مگر بہت سی باتیں مدینہ کی یاد رہ گئی تھیں۔ جب ترپن سال کی عمر میں ہجرت کرکے آپ مدینہ تشریف لے گئے تو ایک بار محلہ بنی عدی میں گذر ہوا۔ لوگوں سے فرمایا کہ اس مکان میں میری والدہ ٹھیری تھیں۔ اور یہ وہ تالاب ہے جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا اور اس میدان میں ایک لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا جس کا نام انیسہ تھا۔

آپ کی والدہ کے انتقال کے بعد حضرت عبدالمطلب آپ کو اور بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ وہ بیحد محبت کرتے تھے۔ کعبہ کے سایہ میں ان کے لئے فرش بچھایا جاتا تھا۔ ان کے بیٹے ادب سے اس کے کنارے بیٹھتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب آتے سیدھے فرش پر اپنے دادا کے پاس چلے جاتے۔ ان کے چچا ان کو پکڑ کر کھینچتے کہ اپنے برابر بٹھلائیں۔ عبدالمطلب فرماتے کہ نہیں۔ اس کو چھوڑ دو۔ میرے اس بچہ کا مزاج شاہانہ ہے اور اس کی شان ہی کچھ اور ہے۔ پھر ان کو اپنے پاس بٹھلاتے اور محبت سے ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تندرستی۔ قوت۔ شکل اور خوش مزاجی کے لحاظ سے اپنے ہم عمر بچوں میں ممتاز تھے اس لئے نہ صرف گھر کے لوگ بلکہ ہر شخص آپ سے محبت کرتا تھا۔

جب آٹھ سال کے ہوئے اس وقت آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب جن کی عمر بیاسی سال کی ہو چکی تھی وفات پاگئے۔ ان کا جنازہ اٹھا تو حضور محبت کی وجہ سے اس کے ساتھ ساتھ روتے ہوئے جاتے تھے۔

حضرت عبدالمطلب کے دس بیٹوں میں سے آنحضرت کے والد عبداللہ۔ اور ابوطالب اور زبیر تینوں ایک ماں سے تھے جن کا نام فاطمہ مخزومیہ تھا۔ اس وجہ سے حضرت عبدالمطلب نے اپنی وفات کے وقت حضور کو پرورش کے لئے آپ کے حقیقی چچا ابوطالب کے حوالے کیا۔ وہ آپ کو اپنے گھر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے اور نہایت محبت اور پیار سے پرورش کرتے تھے۔ خود اپنے بچوں سے بھی زیادہ آپ کا خیال رکھتے تھے۔ سوتے تو ساتھ لیکر سوتے اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے۔

اس زمانہ میں مکہ میں کسی قسم کی تعلیم نہیں تھی۔ نہ کوئی مکتب یا مدرسہ تھا نہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ صرف

کے لڑکے سارے اخلاق و عادات اپنے گھر ہی کے بڑے بوڑھوں سے سیکھتے تھے۔ اور ان میں ان کا شغلہ بکریاں چرانا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس زمانہ میں بکریاں چراتے تھے۔ سمجھو تو دراصل یہ دنیا کی گلہ بانی کی ابتدا تھی چنانچہ اکثر انبیاء جو گزرے ہیں پہلے انہوں نے بکریاں چرائی ہیں۔ حضرت موسےٰ جو بنی اسرائیل میں سب سے بڑے نبی گزرے ہیں وہ تو شبان یعنی چرواہے مشہور تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہو جانے کے بعد کبھی کبھی اپنے بکریاں چرانے کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار اصحاب کے ساتھ جنگل میں جانا ہوا لوگ جھڑبیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ حضور نے فرمایا کہ جو خوب سیاہ ہو جاتی ہیں وہ زیادہ مزے کی ہوتی ہیں۔ اور یہ میرا اس زمانہ کا تجربہ ہے جب بچپن میں یہاں میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔

قریش کا قبیلہ تجارت کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ دستور تھا کہ سال میں گرمی کے موسم میں تجارت کی غرض سے ان کا قافلہ ملک شام میں جاتا تھا اور سردی کے موسم میں یمن میں۔ اس طرح پر وہ ایک ملک کا مال دوسرے ملک میں لیجا کر فروخت کرتے تھے اور نفع کماتے تھے۔ یہی ان کا ذریعہ معاش تھا اور اسی سے وہ خوشحال تھے۔ ایک بار حسب دستور حضرت ابوطالب قریش کے قافلہ کے ساتھ شام کے سفر پر جانے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جن کی عمر اس وقت نو سال کی تھی ان کے ساتھ جانا چاہا۔ وہ سفر کی تکلیف کے خیال سے آپ کو اپنے ساتھ لیجانا نہیں چاہتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ساتھ اسقدر محبت تھی کہ جب وہ روانہ ہونے لگے تو آپ دوڑ کر لپٹ گئے۔ حضرت ابوطالب نے آپ کا دل توڑنا گوارا نہ کیا اور ساتھ لے لیا۔ اہلِ قریش جب ملک شام کے مشہور بازار بصرے میں پہونچے تو وہاں ایک راہب نے جس کا نام بحیرا تھا ان لوگوں کو اپنی خانقاہ میں ٹھیرایا اور کھانا کھلایا۔ اس کی نظر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو ابوطالب سے کہا کہ تم جس قدر جلد ممکن ہو اس بچہ کو اپنے وطن واپس لیجاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی یہودی دشمن ان کو دیکھ پائے اور نقصان پہونچائے۔ کیونکہ آسمانی کتابوں میں آخری پیغمبر کی جو نشانیاں بتائی گئی ہیں وہ ان میں پائی جاتی ہیں چنانچہ حضرت ابوطالب خرید و فروخت سے فارغ ہوتے ہی نہایت حفاظت کے ساتھ آپ کو مکہ واپس لائے۔

جب آپ کی عمر چودہ سال کی ہوئی اس وقت مکہ میں فجار کی لڑائی پیش آئی جو زمانہ جاہلیت کی بڑی ہولناک اور مشہور لڑائیوں میں شمار کیجاتی ہے۔ یہ جنگ قریش اور بنی قیس میں ہوئی تھی۔ قیس کے قبیلہ نے عہد توڑ دیا تھا۔ اور حرم کے اندر گھس آئے تھے۔ اور اس مہینہ میں جس میں لڑائی حرام ہے۔ بعض آدمیوں کو

قتل کر ڈالا تھا۔ اسی وجہ سے اس جنگ کا نام فجار یعنی ناحق کی لڑائی رکھا گیا۔

مقابلہ کے لئے قریش کے تمام خاندان متفق ہوئے اور ایک لشکر تیار کیا جس میں ان کا ہر ایک کنبہ اپنی اپنی الگ جماعت بنا کر شریک ہوا۔ آنحضرت کے حقیقی چچا زبیر بن عبدالمطلب اپنے کنبہ یعنی آل ہاشم کے علمبردار تھے۔ روزانہ کچھ لوگ مقابلہ کے لئے نکلتے۔ ایک دن بڑے زور کا رن پڑا۔ اس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے۔ آپ دشمنوں کے تیروں کو چن چن کر اپنے چچاؤں کو لا کر دیتے تھے۔

آخر میں دونوں فریقوں نے آپس میں صلح کی اور لڑائی ختم ہوگئی لیکن چونکہ اس لڑائی میں بہت لوگ مارے گئے تھے اور بہت سے بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوگئی تھیں اس وجہ سے قریش کے سرداروں نے مل کر آپس میں قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ اُن کی حمایت کریں گے جن پر ظلم کیا جائے گا اور ظالموں کا مقابلہ کریں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس حلف میں موجود تھے۔ اور نبوت کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ میں خوش ہوں کہ اس محفل میں شریک تھا اور آج بھی اس قسم کے معاہدہ کیلئے اگر کوئی جماعت مجھکو بلائے تو میں تیار ہوں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے چونکہ اپنی آخری اور سب سے بڑی رسالت کے لئے پیدا کیا تھا۔ اس وجہ سے ان کو بچپن ہی سے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ وہ بچوں میں سب سے بہتر اور پیارے بچے تھے اور ان تمام عیبوں سے پاک تھے جو مکہ کے دوسرے بچوں میں تھے۔ وہ اپنے رفیقوں سے نہ کبھی لڑتے تھے نہ جھگڑتے تھے نہ کبھی کوئی برا کلمہ اپنی زبان سے نکالنا گوارا کرتے تھے۔ بچپن میں ایک بار آپ کے ساتھ کھیلنے والے بچے پتھر کے ٹکڑے کندھوں پر اٹھا اٹھا کر ڈھو رہے تھے۔ سب نے اپنے اپنے تہمد کھول کر کندھوں پر رکھ لئے تھے۔ آنحضرت کا کندھا پتھروں کے ڈھونے کی وجہ سے چھل گیا تھا یہ دیکھ کر آپ کے چچا حضرت عباس نے کہا کہ بھتیجے تم بھی اپنا تہمد کندھے پر رکھ لو۔ حضور نے جوں ہی ان کے کہنے پر عمل کیا۔ اپنی عریانی کے خیال سے غش آنے لگا۔ اور فوراً تہمد باندھ لیا۔

آپ کی قوم بت پوجتی تھی مگر آپ نہ کبھی ان کی عبادتوں میں جاتے تھے نہ بتوں پر چڑھائی ہوئی کوئی چیز کھاتے تھے اور نہ ان کی مشرکانہ رسموں میں شریک ہوتے تھے۔ جن محفلوں میں باجا اور راگ ہوتا تھا ان میں کبھی نہیں جاتے تھے۔ غرض جاہلیت کی ہر قسم کی برائیوں سے اللہ نے آپکو محفوظ رکھا۔ آپ شروع ہی سے اپنے عادات اور اطوار کی وجہ سے مکہ کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز بچے تھے۔ اور پھر آپ کی عمر جس قدر بڑھتی گئی آپکی نیکی سچائی اور شریفانہ خصلتوں کی وجہ سے قوم کی نگاہوں میں آپ کی عزت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ جوان ہونے پر ان کے اوپر بھروسہ ہو گیا۔ اور ساری قوم آپ کو امین کے لقب سے پکارنے لگی۔

بابُ المراسلات

ایک دلچسپ غلط فہمی اور اس کا ازالہ

۵۱ - نورجہاں روڈ - نئی دہلی -

محترمی اخوندزادہ صاحبؒ - سلام مسنون - براہ کرم یہ چند سطور طلوع اسلام کی آئندہ اشاعت میں درج فرمادیں۔ سپاس گذار ہوں گا -

شروع اپریل میں ایک صاحب کا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا کہ خوشی ہوئی کہ ایک عرصہ کے بعد ۱۰ اپریل کو بتقریب سعید عید میلادالنبی پھر تمہاری تقریر سننے کا موقعہ ملے گا - میں یہ خط دیکھکر متعجب ہوا - کیونکہ مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا - دہلی ریڈیو کا پروگرام دیکھا تو اس میں "پرویز" کا نام موجود تھا - لیکن یہ کوئی اور صاحب تھے - اتفاق کہ وقت مقررہ پر ان کی تقریر بھی نہ ہوسکی کیونکہ اس وقت نواب صاحب بھوپال کی تقریر براڈکاسٹ ہو رہی تھی - اس کے بعد چند ایک احباب نے افسوس ظاہر کیا کہ تمہاری تقریر نہ ہوئی اور ہم خواہ مخواہ اتنے دن انتظار میں رہے -

یہ تقریب گذری تو اس کے بعد اس قسم کے خطوط آنے شروع ہوگئے جن میں یومِ اقبالؒ پر میری تقریر کا حوالہ دیا گیا تھا - پروگرام دیکھا تو اس میں پھر "پرویز" کا نام درج تھا - یہ بھی کوئی دوسرے صاحب تھے جنہوں نے ۲۱ اپریل کو حضرت علامہ اقبالؒ کے ساقی نامہ سے کچھ اشعار پڑھ کر سنائے - جاننے والے احباب تو پہچان گئے ہونگے کہ یہ میں نہ تھا لیکن نہ جاننے والے شاید مزید استفسارات کریں - انہی کی اطلاع کے لئے اس غلط فہمی کے ازالہ کی ضرورت محسوس کی گئی ہے - اور چونکہ یہ احباب حلقۂ طلوع اسلام میں سے ہیں - اس لئے طلوع اسلام میں ان سطور کی اشاعت ضروری خیال کی گئی - ظاہر ہے کہ یہ نام جسٹری شدہ تو ہے نہیں کہ اس کے جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ" کرائے گئے ہوں - جس کا جی چاہے یہ نام رکھ سکتا ہے اور لکھ سکتا ہے البتہ کسی مزید غلط فہمی کے امکانات کو روکنے کے لئے میں اس امر کا التزام رکھوں گا کہ اپنا پورا نام

لکھا کروں گا۔ خدا کرے کہ اس پورے نام والے کوئی اور صاحب نہ ہوں۔ ورنہ

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

والسلام

غلام احمد پرویز ۲۲ اپریل

{اور تو اور ہم خود اس غلط فہمی میں مبتلا تھے جو اس وقت دور ہوئی جب ہم نے جناب پرویز صاحب سے ان کی تقریر کا مسودہ بغرض اشاعت مانگا۔ اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری تھا کیونکہ پرویز صاحب کی گذشتہ تقاریر سے متعلق جس قدر خطوط ہمیں موصول ہوئے ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حلقۂ طلوع اسلام میں ان کی تقاریر کا کس بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ جناب پرویز صاحب نے جو علاج سوچا ہے ہمیں اس سے اتفاق ہے لیکن اس کی ضرورت باہر کی دنیا کے لئے ہوگی۔ طلوع اسلام میں ایسا اشتباہ ممکن نہیں یہاں پرویز سے دوسرا کون مفہوم ہو سکتا ہے۔ طلوع اسلام }

سلیم کے نام ــــــــ ساتواں خط

(CHANGE)

تم نے ٹھیک کہا سلیم! یہ جیمز بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ دلچسپ بھی اور گہرا بھی۔ تم تو صرف دو تین روز یہاں رہے۔ اور میں اُسے ایک مدّت سے اسی طرح دیکھ رہا ہوں۔ وہ ٹھیک ایک بجے ٹفن روم[1] میں آجاتا ہے۔ لیکن کچھ کھاتا پیتا نہیں۔ سگریٹ پیتا رہا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور چلا گیا۔ ایکدن میں نے پوچھا کہ جیمز جب تم کھاتے پیتے کچھ نہیں تو یوں باقاعدہ ٹفن روم میں کس لئے آجاتے ہو! کہنے لگا "یونہی چینج (CHANGE) کے لئے۔ دس بجے سے ایک بجے تک دفتر کے کام کی یکسانیت سے طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ اور خوامخواہ جی چاہتا ہے کہ تنوع پیدا کرنے کے لئے کسی اور طرف دھیان بٹ جائے۔"

سلیم! ذرا اپنے گردوپیش نگاہ دوڑاؤ تو تمہیں محسوس ہو جائیگا کہ یہ "چینج" کا فلسفہ محض دفتر اور ٹفن روم ہی تک محدود نہیں بلکہ حیاتِ انسانی کے ہر گوشے میں اور کاروبار کے ہر شعبے میں اسکا عمل جاری و ساری ہے، کوئی کام کتنا ہی دلچسپ اور آپکی طبیعت سے کیسا ہی مانوس کیوں نہ ہو، کچھ عرصہ کے بعد اُسکی یکسانیت سے طبیعت اُکتا جائیگی۔ اور تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اس تبدیلی کا نام راحت ہے اسی میں آرام کا راز مضمر ہے۔ بیٹھنے والے کی خوشی اس میں ہے کہ اُٹھ کر تھوڑی دیر تک چلنے لگ جائے اور چلنے والے کا آرام اس میں ہے کہ تھوڑے وقت کے لئے بیٹھ کر دم لے لے۔ حریر و اطلس کے نرم و نازک گدیلوں پر لیٹنے والے کے لئے تھوڑی سی ورزش کی خواہش فطری معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک

---

[1] وہ کمرہ جس میں بیٹھ کر دوپہر کے وقت تفنگا کچھ کھایا پیا جاتا ہے۔

ہیزم کش مزدور کے لئے ذرا سی دیر بیٹھ کر حقّے کے دو کش لگا لینے میں ہی سکون ہے۔ جاگنے والے کے لئے سونا ایسا ہی سامانِ راحت ہے جیسا سونے والے کے لئے جاگنا۔ نہیں! بلکہ مرزا نوشہ سے پوچھئے تو اُن کے نزدیک جینے کا لطف بھی مرنے کے "چینج" کا رہینِ منت ہے۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا؟

بہرکیف "تبدیلی" کی ضرورت انسان کے لئے کچھ فطری سی معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک انسان ہی پر کیا موقوف ہے۔ عام قوانینِ فطرت میں بھی تبدیلی کا دولابی فلسفہ کارفرما ہے۔ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن۔ بہار سے خزاں اور خزاں سے بہار۔ گرمی سے سردی اور سردی سے گرمی۔ یہ سب اسی "چینج" کے کرشمے اور "تبدیلی" کی نیرنگیاں ہی تو ہیں۔ جوئے حیات کی سادہ اور پُرسکوت روانیوں میں قوسِ قزح کے سے رنگین ہلکورے ہیں تو اسی کی جنبش سے۔ اور آنسوؤں کے دھندلکے میں قہقہوں کی ضیا پاشیاں ہیں تو اسی کے دم سے۔ اور سچ پوچھو تو سلیم! یہ سب نادرہ کاریاں ہیں اُس صنّاعِ بے ہمتا کی جس کی خود صفت ہے کہ "کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شَان" وہ ہر آن میں ایک نئے انداز میں جلوہ ریز ہوتا ہے۔

ظواہر و محسوس کی یہ سب تبدیلیاں تمہارے سامنے ہیں۔ لیکن آؤ سلیم! تمہیں ایک ایسی تبدیلی۔ ایک ایسے چینج سے روشناس کراؤں جو یکسانیت میں تنوع پیدا کرنے کے علاوہ ہزاروں مقاصدِ عالیہ در آغوش ہے۔ ذرا غور کرو۔ خدا کا ایک بندہ۔ چاشت کے وقت سے گھر سے نکل کر انتہائی جذب و انہماک کے ساتھ دُنیاوی مشاغل۔ کاروباری مقاصد میں مصروفِ عمل ہے۔ کیونکہ اس کے خدا کا فرمان ہے۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ (ماحصلِ زندگی باندازۂ سعی و عمل ہے) معاملہ زیرِ نظر کو بطریقِ احسن سرانجام دینے کے لئے وہ اپنے قلب و دماغ کی تمام صلاحیتوں کو ایک نقطۂ ماسکہ پر مرکوز کئے بیٹھا ہے۔ کاروبار کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کے لئے اپنی تمام توجہات کو ایک خاص زاویہ پر ملتفت کئے ہے۔ تجارت ہے۔ یا ملازمت۔ دستکاری ہے یا زراعت۔ ذمہ داریوں کا احساس اس کی تمام قوتوں کو بروئے کار لاتا چلا جا رہا ہے۔ اُدھر طاغوتی قوتیں بھی بے خبر نہیں ہیں۔ اُنھوں نے اپنے

ابلیسانہ دامِ تزویر کو قدم قدم پہ بچھا رکھا ہے۔ کیونکہ اس نے روزِ اوّل سے ہی ذرّیتِ آدم کو یہ چیلنج دے رکھا ہے کہ۔

ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَن شَمَائِلِهِمْ۔

میں یقیناً اُن کے آگے۔ پیچھے۔ دائیں۔ بائیں سے اُن پر حملہ آور ہوں گا۔

کہیں مال کی محبت کا دیوتا۔ زرق برق لباس میں ملبوس۔ مرصع زیورات سے مزیّن اپنے جھوٹے نگوں کی برق پاشیوں سے اُسکی آنکھوں میں خیرگی پیدا کر رہا ہے کہ حق و باطل جائز و ناجائز۔ خبیث و طیّب کا امتیاز اُٹھ جائے۔ اور کہیں اولاد کی محبت کا بُت اپنی حسین دلآویزیوں اور معصوم رعنائیوں سے اُس کا دل برما رہا ہے۔ کہیں جلبِ منفعت کا خیال کسی کے سنگِ آستاں کو قبلۂ حاجات بنا کر دکھا رہا ہے۔ اور کہیں دفعِ مضرت کا تصور کسی مٹی کی مورتی" میں شانِ کبریائی پیدا کر رہا ہے۔ کہ اتنے میں کان میں آواز آتی ہے

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر

یہ تمام معبودِ باطل۔ یہ اصنامِ خیالی جھوٹے۔ یہ تو برف کے مجسمے ہیں جو آفتابِ حقیقت کی تمازت سے پگھل کر پانی ہو جائیں گے۔ یہ بڑائی کے سزاوار کیسے! بڑائی ہے تو اُسی ایک کے لئے۔ کبریائی ہے تو اُسی کے لئے۔ وہی مالک الملک ہے۔ اُس کے سوا کوئی ایسا نہیں جسکے سامنے جھکا جائے جسے قبلۂ مقصود اور کعبۂ حاجات تصور کیا جائے۔ یہ آواز کان میں پڑتی ہے تو یہ مہک انسان چونک پڑتا ہے۔ ابلیسی قوتوں اور طاغوتی ابلہ فریبی کی ملمع کاریوں پر حقارت کی نگاہ ڈالتا ہے۔ طبیعت کام کی یکسانیت سے اُکتا چکی تھی" چیلنج" کے لئے کارگۂ عالم کا بھرا میلہ چھوڑ کر اس دعوت پر لبیک کہتا ہوا مسجد کی طرف آجاتا ہے۔ سستاتا ہے، دم لیتا ہے۔ تر و تازہ ہوتا ہے اور خشیتِ قلب کی ایک تھرتھراہٹ سے تمام دنیا کے علائق و سلاسل کو توڑ کر وجد و مسرت سے پکار اُٹھتا ہے۔

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔

میں (تمام دنیا کی جاذبیتوں سے منہ موڑ کر) اپنی توجہات اس ذات کی طرف مرکوز کرتا ہوں جو بلندیوں اور پستیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

مال کی محبت جھوٹی، اولاد کا حُبّ باطل — مال کا اکتساب اس لئے ضروری ہے کہ یہ متاعِ حیات اُس کا نام بلند کرنے کے کام آئے ورنہ اگر حصولِ مال، مقصود بالذات بن جائے تو یہ وہ سنہری اور روپہلی طوق و سلاسل ہیں جو شرفِ انسانیت اور جوہرِ خودی کو شکنجے میں کس دیتے ہیں۔ اور اولاد کی تمنّا اس لئے کہ وہ وارثینِ کتاب، خداوندی کی جماعت کا صالح عنصر بنیں۔ ورنہ اولاد تو وُہ "فتنہ" ہے جس کی خاطر انسان بالعموم جائز و ناجائز کی تمیز اُٹھا دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سعیٔ عمل تھا تو اس لئے کہ اُس نے ایسا کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ اور پوری جد و جہد کے بعد اب نتائجِ حسنہ کے لئے بھروسہ ہے تو اُسی کے فضل پر۔ اگر بھروسہ اپنی ہی ہنرمندی اور اعتماد اپنے ہی زورِ بازو پر ہو جائے تو یہ سب سے بڑا شرک ہے۔ لہٰذا اس عبدِ مومن نے سب سے پہلے اس امر کا اقرار کیا۔ کہ

مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ

اب صبح سے لیکر اس وقت تک کے اعمال و افعال۔ حرکات و سکنات۔ دل کی جنبشوں اور نگاہ کی خیانتوں کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ جہاں اُس کی بارگہِ صمدیت سے افضال و اکرام کی بارشیں ہوئیں۔ اِس کی طرف سے کچھ لغزشیں اور خامیاں سرزد ہو گئیں۔ لہٰذا اُس کے انعامات کا شکریہ۔ اپنی خطاؤں کا اعتراف، مختلف انداز اور پیرایوں میں کیا گیا۔ کہیں اُس کے حضور میں دست بستہ سر جھکائے کھڑے ہیں۔ کہیں اُسکے جبروت و کبریائی سے لرزاں جھک جھک گئے ہیں۔ کبھی افزائشِ نعمت کی دُعائیں مانگیں۔ اور کبھی عفوِ خطا کے لئے پاؤں پکڑ لئے۔ دُنیا میں ہزاروں چیزیں ایسی نظر پڑی تھیں جنھیں دیکھ کر بے ساختہ حمد و ستائش کے الفاظ زبان تک آ گئے تھے۔ اب جو اُس کے حضور پہنچے

جس نے ان تمام اشیاء کو وہ خوبیاں عطا کی ہیں جن کی بنا پر وہ قابلِ تحسین و تبریک سمجھی گئیں تو سرِ نیاز کو جھکائے ہوئے سب سے پہلے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ ہر قسم کی حمد و ستائش کی سزاوار صرف تیری ہی ذات ہے کہ جملہ کائنات کی حسن و خوبی۔ رعنائی و زیبائی۔ جلال و جمال تیری ہی شان ربوبیت کی کرشمہ سازی اور تیری ہی رحمتوں کی مظہر ہے۔ حمد و ستائش اور تعریف و توصیف کے بعد اس حقیقت عظمیٰ کا اقرار کیا کہ دُنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جس کی عبودیت اختیار کی جائے۔ اور جس سے مدد کی درخواست کی جائے۔ محکومیت ہے تو صرف تیری اور استعانت ہے تو تجھ سے رہروِ منزلِ ہستی کو ہمیشہ سیدھے راستے کی تلاش رہتی ہے۔ اس کے لئے بھی اُس کے حضور دُعائیں مانگیں۔ اس راستہ کی دُعائیں جس پر چلکر وہ لوگ فائز المرام ہوئے جنکی زندگیاں آنے والوں کے لئے مشعلِ ہدایت بنیں۔ اور جن کے اعمالِ صالح کے نتائج نے واضح طور پر بتادیا کہ خدا کے انعام و اکرام اور اس کے غضب و عتاب کی کھلی کھلی نشانیاں کیا ہیں۔ ان التجاؤں اور تمناؤں۔ ان آرزوؤں اور دُعاؤں کے بعد اس حاضر و ناظر خدا کے حضور کہیں ایفائے عہد اور حسنِ معاملہ کا اقرار کیا جا رہا ہے۔

بلیٰ من اوفیٰ بعھدہ واتقیٰ   ہاں جو ایفائے عہد کرے گا اور تقویٰ شعار ہوگا۔

اور کہیں عدل و انصاف کو اپنا مطمحِ نگاہ قرار دیا جا رہا ہے۔

قل امر ربی بالقسط۔   کہدے کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔

کہیں غلط بیانی اور جھوٹی شہادت سے اجتناب کے حکم کو دُہرایا جا رہا ہے۔

والذین لا یشھدون الزورا   جو لوگ کبھی جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

اور کہیں لغویات سے احتراز کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

واذا مروا باللغو۔ مروا کراما   اور جب لغو کے پاس سے گذرتے ہیں تو شریفوں کی طرح سمٹے سمٹاتے۔ بچتے بچاتے گذر جاتے ہیں

کہیں لا تمش فی الارض مرحا (زمین میں اکڑ کر نہ چل) کے فرمان کی یاد سے کبر و نخوت

اور خود رائی و خود ستائی کی گردن توڑی جا رہی ہے اور کہیں وات ذالقربیٰ حقہ والمسٰکین وابن السبیل (رشتہ داروں، مساکین اور مسافروں کو ان کا حق دیدیا کرو) کی نصیحت سے دل کو ایثار و انفاق پر مائل کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ولا تبذر تبذیرا (فضول خرچی کر) کی تلقین سے میانہ روی کا سبق سکھا جا رہا ہے۔ کہیں معاشرتی اصولوں کی تبئین سے تقسیم عمل کا فلسفہ ذہن نشین ہو رہا ہے۔

نحن قسمنا بینهم معیشتهم فی الحیوٰۃ الدنیا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجٰت لیتخذ بعضهم بعضاً سخریا

دنیاوی زندگی میں ہم ان کی روزی تقسیم کرتے ہیں اور با عتبار مدارج ایک کو دوسرے پر فوقیت دیتے ہیں تاکہ ایک، دوسرے کو کام میں لگائے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ انما المؤمنون اخوۃ (تمام مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں) سے مساوات واخوت کا بنیادی اصول اجاگر کیا جا رہا ہے۔ اور نسلی امتیازات اور خاندانی تفاخر کے زعمِ باطل پر معیارِ تقویٰ سے خطِ تنسیخ کھینچا جا رہا ہے (ان اکرمکم عند اللہ اتقکم) کہیں واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً (سررشتۂ دینِ خداوندی سے من حیث الجماعت متمسک رہنے) کے فریضہ کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ کہیں وامرهم شوریٰ بینهم (معاملات میں باہمی مشاورت) کے حکم سے سیاسیات کے مبانی و مبادی کی یاد تازہ کرائی جا رہی ہے۔ کہیں جہانبانی و کشورکشائی کے رموز بتائے جاتے ہیں۔

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصالحین

ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ یقیناً وراثتِ زمین کے حقدار صالحین ہیں۔

اور کہیں ان کے تمکن فی الارض کی غرض وغایت نمایاں طور پر قلب کی گہرائیوں میں

اُتاری جاتی ہے۔

الذین ان مکنهم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ۲۲/۴

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انھیں تمکن فی الارض عطا ہوگا تو یہ خدا کی صلوٰۃ کو قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ معروف کا حکم کریں گے اور منکر سے روکیں گے۔

غرضیکہ حفظ نفس۔ تدبیر منازل اور سیاسیات مدن کا کوئی شعبہ نہیں جس کی اصلاح کی تدبیر نہ بتائی جارہی ہو۔ اس رازونیاز، اس اقرار واعتراف۔ اس تجدید عہد وپیمان۔ ان دعاؤں اور التجاؤں کے بعد وہ عبد مومن پھر اُسی دنیا میں لوٹ جاتا ہے۔ جہاں سے آیا تھا۔ اور وہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہکر پھر انہی انسانوں میں آملتا ہے جن سے الگ ہو کر وہ اس نئی دنیا میں چلا گیا تھا۔ اب اُسے پھر حکم مل گیا کہ

فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیرًا لعلکم تفلحون

اور جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں (پھر سے) بکھر جاؤ اور (کاروبار میں) اللہ کے فضل کی تلاش کرو اور (جوں جوں انہماک بڑھتا جائے) اللہ کی یاد بھی زیادہ ہوتی جائے۔ اسی میں تمہاری کامیابی کا راز ہے۔

دیکھا سلیم! تم نے۔ کیسا ہے یہ چینج؟ غور کرو کہ اس چینج کے اندر کس قدر صحیح مسرتوں اور حقیقی راحتوں کے سامان پوشیدہ ہیں۔ دو چار گھنٹے پھر اُسی شغف وانہماک سے جدوجہد حیات میں مصروف کار رہے۔ اتنے میں عصرانہ (شام کی چائے) کا وقت آگیا۔ صبح سے دوپہر تک، کام کاج کے لئے زیادہ وقت دیا گیا کیونکہ ابھی تازہ دم گھر سے نکلے تھے۔ دوپہر سے سہ پہر تک کا وقفہ کم ہو گیا کہ اس میں جلدی تھک جانے کا امکان تھا۔ پھر وہی اللہ اکبر کی آواز کان میں آگئی۔ پھر اس نے در و دیوار میں ایک غلغلہ اور قلب ونظر میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ پھر وہی تجدید عہد وپیمان ہوئی۔ پھر بھولا ہوا سبق دُہرایا گیا۔ اُس کے بعد کاروبار سے فارغ ہوئے تو سیر و تفریح کے لئے نکل گئے

تھک گئے تو پھر چلنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پھر یہ یاد دلادیا کہ جسم کی حفاظت اور پرورش اس لئے ضروری ہے کہ یہ رُوح کا پیکر ہے۔ قلعہ کی مضبوطی سے غرض ہی یہی ہے کہ اس کے اندر فوج کی حفاظت ہو۔ اگر کسی قلعہ میں زندہ فوج کی جگہ مردہ سپاہی ہوں۔ تو قلعہ کی مضبوطی کس کام کی؟ یہ تھا دوپہر سے شام تک کا پروگرام۔ اس کے بعد رات آئی۔ رات کے متعلق سلیم! کیا تمہیں وہ منظر یاد ہے جو گذشتہ سرما میں نگاہوں کے سامنے سے گذرا تھا؟ تم غالباً بھول گئے ہوگے۔ لیکن میرے دل پر تو یہ چیزیں نقش ہوکر رہ جاتی ہیں۔ قریب گیارہ بجے شب کا وقت۔ چاندنی چوک میں ریل پیل ختم ہو چکی۔ عام طور پر دُکانیں بند ہو گئیں۔ البتہ کہیں کہیں کسی دُکان کا آدھا کواڑ کھلا ہے۔ دُکاندار لیمپ کے سامنے بہی کھاتے کے کاغذات کھولے بیٹھا ہے اور دن بھر کے لین دین کے حساب میں منہمک ہے۔ جب تک سارا حساب صاف نہیں ہوجائے گا۔ سوئیگا نہیں۔ اس سنّاٹے کے عالم میں نگاہ چاندنی کی مرمریں گرد سے گذر کر سامنے مسجد فتحپوری کے حوض سے تیرتی ہوئی محرابِ مسجد تک چلی گئی۔ جہاں ایک اللہ کا بندہ آخری نماز کی آخری رکعت میں کھڑا ہے۔ باہر بازار میں دُکاندار دن بھر کے حساب کتاب کا جائزہ لے رہا ہے۔ مسجد میں اللہ کا یہ بندہ اپنے دن بھر کے کاموں کی فردِ عمل کھولے حساب کتاب کی جانچ پڑتال میں مصروف ہے۔ صبح سے اس وقت کی تمام کشمکش پر ناقدانہ نگاہ ڈالے ایک ایک شئے کو معیارِ حق و باطل پر پرکھتا جارہا ہے اور دیکھتا ہے کہ دن بھر کی "تجارت" میں حاصل کیا ہوا؟ فردِ عمل ختم ہوتی ہے۔ اس بارگاہِ صمدیت کے سامنے جھولی پھیلائے جھکی ہوئی نگاہوں۔ لرزتے ہوئے دل اور کانپتی ہوئی آواز میں دُعائیں مانگی جاتی ہیں کہ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُكَ ۔۔ بارِ الٰہا! ہم تیرے سوا کسی اور سے مدد نہیں مانگتے۔ جب تو آقا اور مالک ٹھہرا تو جدوجہد زندگی میں کسی اور سے مدد کیوں مانگیں؟ ہم جانتے ہیں کہ ہم سے دن بھر میں کئی کوتاہیاں ہو گئیں۔ تکمیل معاملات میں خامیاں رہ گئیں۔ لیکن ان لغزشوں اور خامیوں کی پردہ پوشی بھی تو ہی کرنیوالا ہے۔ تیرے سوا اور کون ہے جو ان سے درگذر کرے۔ (وَنَسْتَغْفِرُكَ) ہم تجھ ہی پر ایمان رکھتے ہیں۔ تیرے سوا کسی اور کو مانتے ہی نہیں۔ (وَنُؤْمِنُ بِكَ) اس لئے تیرے سوا بھروسہ

اور کس پر رکھیں۔ تیری ہی ذات اعتماد کے قابل ہے۔ تجھی پر بھروسہ رہے ہے۔ (وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ) اور ہر قسم کی بھلائیوں اور بہبودیوں کی طلب بھی تیری ہی سرکار سے ہے۔ اور ہر قسم کی ستائش و توصیف بھی تیرے لئے ہے۔ (وَنُثْنِيْ اِلَيْكَ الْخَيْرَ) تیری عطا فرمودہ قوتوں اور نعمتوں کو ہم اس انداز میں صرف کرنے کے لئے مجاز ہیں جو انداز تو نے خود متعین فرما دیا ہے (وَنَشْكُرُكَ) اس کے خلاف اس کا استعمال ناسپاس گذاری ہے۔ (وَلَا نَكْفُرُكَ) اس حمد و ستائش، اس اعتماد اور بھروسہ۔ اس ایمان وایقان سے وہ عبدِ مومن شرفِ انسانیت اور استحکامِ خودی کی بلندیوں پر سرفراز ہوتا جاتا ہے۔ جہاں پہونچکر وہ ساری دنیا کو مخاطب کر کے اپنے اللہ سے اقرار کرتا ہے۔ اعلان کرتا ہے کہ (وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ) اے اللہ جنھوں نے تیرے ضابطۂ قوانین سے سرکشی اختیار کی ہے۔ جو تجھ سے بیگانہ ہوئے ہیں۔ جو تیری محکومیت کی بجائے اوروں کی غلامی کے طوق زیبِ گلو کئے ہیں ہمارا ان سے کیا واسطہ ہم ان سے بیزار ہیں۔ ان سے قطع علائق کرتے ہیں۔ وہ بیوی ہو یا بچے۔ باپ ہو یا بھائی۔ عزیز واقارب ہوں یا دوست اور احباب۔ ہمارا ان سے کوئی رشتہ نہیں۔ رشتہ ہے تو تیری نسبت سے۔ علاقہ ہے تو تیری وجہ سے۔ جہاں یہ رشتہ نہیں۔ وہاں کوئی رشتہ نہیں۔ جہاں یہ علاقہ نہیں وہاں کوئی علاقہ نہیں۔ ہم چونکہ صرف تیری محکومیت کو تسلیم کرتے ہیں (اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ) اس لئے ہمارا رشتہ اور علاقہ صرف ان سے قائم ہو سکتا ہے جو اس رشتہ میں ہم سے مشترک ہوں۔ اور جب محکومیت تیری ہے تو پھر جھکنا بھی تیرے ہی سامنے زیبا ہے۔ مانگنا بھی تجھی سے بنتا ہے لہٰذا ہماری نمازیں۔ ہماری قربانیاں۔ ہمارا مرنا ہمارا جینا سب تیرے لئے ہے۔ (وَلَكَ نُصَلِّيْ وَنَسْجُدُ) تو ہمارا آقا۔ ہم تیرے غلام۔ غلاموں پر جب بھی کوئی مشکل آئیگی تو آقا ہی کی طرف دوڑیں گے اور جتنی بڑی مشکل ہوگی اتنی ہی تیزی سے پناہ جوئی کے لئے دوڑیں گے (وَاِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ) اس اُمید پر (اور صحیح امید پر) کہ جب تیری رحمتوں کے شامیانہ کے نیچے چلے جائیں گے تو پھر کوئی آفت ہمیں گزند نہیں پہنچا سکی گے۔ (وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ) اور اگر اس

شامیانہ سے باہر رہ گئے تو دُنیا میں پناہ کا کوئی ذریعہ پناہ نہیں دے سکے گا۔ (وَ نَخْشٰی عَذَابَكَ) اس وقت مصیبتوں کا ہجوم اور مشکلات کا سیلاب چاروں طرف سے گھیرلے گا۔ اُنھیں گھیرلے گا جو تیری پناہ سے انکار کرنے والے ہونگے (اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِق) ہم تو اے آقا! ایسے نہیں ہیں۔ ہمیں اپنی پناہ میں رکھیو۔ اس کے بعد ہمیں دنیا میں کسی سے خوف اور کوئی حزن نہیں ہوگا۔

ان دُعاؤں اور التجاؤں کے بعد فرطِ عجز دنیا زمیں جھُوم کر جھک گئے اور وہ سر جو دُنیا میں بڑی بڑی بلند چوکھٹوں سے مستانہ وار بے نیاز گذر گیا تھا۔ اس کے حضور سجدے میں گر گیا۔ اُس سجدے میں جو دُنیا بھر کے سجدوں سے بے نیاز کر دینے والا ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اس سجدے کے بعد یہ عبد مومن۔ اپنے آپ کو اللہ کی پناہ وحفاظت میں سونپ کے سو گیا پورے اطمینان کی نیند۔ پورے سکون کی خواب نوشیں کے بعد صبح کو اُٹھا۔ پھر سے ایک نئی زندگی شروع ہوئی۔ لوگ اپنے اپنے کاروبار کی طرف مشغول ہوئے۔ لیکن "بلاکشانِ محبت کوئی یار رِند" اُس نے جو نیا ورق اُلٹا تو ابتداء انہی معصوم دُعاؤں اور انھی التجاؤں۔ انھی وعدوں اور انھی تمناؤں سے کی۔ اور اس کے بعد پھر میدانِ سعیٔ وعمل میں آگیا۔ پھر وہی معمول شروع ہوگیا۔ ساری زندگی اسی طرح بسر ہوئی۔ اور سلیم! غور کرو کہ کیسی اچھی بسر ہوئی۔

"چیلنج" کی ضرورت طبعی سی تھی۔ لیکن دیکھا تم نے۔ سلیم! چیلنج اور چیلنج میں فرق! ایک چیلنج وہ کہ دفتر کے کمرے سے اُٹھے تو ٹفن روم میں جا بیٹھے۔ گھر میں طبیعت گھبرائی تو سیر کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ شروع سے اخیر تک وہی طبعی زندگی۔ وہی اس کی حیوانی ضروریات کہیں شرفِ انسانیت کا خیال نہیں۔ کبھی بلندیوں کی طرف نگاہ نہیں۔ لیکن ایک چیلنج یہ کہ یہ

سب کچھ ہوتا رہے۔ اور اس کیساتھ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد روح کی بالیدگی کے سامان بھی بہم پہونچتے رہیں۔ ایسے سامان کہ جن سے مقصدِ زندگی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے راہرو۔ راستہ کی نظر فریب جاذبیتوں میں ہی کھو کر نہ رہ جائے۔ نگاہ نصب العین پر ٹکی ہو اور قدم منزل کی طرف بڑھتے جائیں۔ اور سفرِ زندگی یوں شاداں و فرحاں کٹ جائے کہ تکان محسوس نہ ہو۔ کبھی راستہ کھو جانے کا خطرہ دامنگیر نہ ہو۔ کیسا خوش بخت ہے یہ راہرو اور کتنا قابلِ رشک اس کا سفر۔ طوبیٰ لھم وحسن مآب

یوں تو سلیم! ایک عبدِ مومن کا ہر سانس عبادت ہے۔ ایک وفا شعار ملازم کا اُٹھنا بیٹھنا سونا۔ جاگنا۔ چلنا پھرنا۔ سب خدمتگذاری کے مختلف انداز ہیں۔ لیکن اظہارِ عبودیت کے لئے جو طریقِ عبادت ضابطۂ قرآنی نے متعین اور اُسوہ نبیٔ اکرمؐ نے متشکل فرمایا ہے۔ وہ از خود فقید المثال اور ناقابلِ تغیّر و تبدل ہے۔ اس مختصر سے خط میں تمثیلاً اس کے صرف ایک پہلو کے متعلق کچھ لکھ سکا ہوں۔ ورنہ اس کی تشریح و تفصیل کے لئے بڑی فرصت و گنجائش کی ضرورت ہے۔ ہزار بار لکھ چکا ہوں کہ یہ سب باتیں مَعَارِفُ الْقرآن میں آجائیں گی۔ لیکن تمہاری بیتابیٔ تمنّا کا کیا علاج کہ اتنا بھی انتظار نہیں کر سکتے۔ اور پھر سوچتے نہیں کہ مجھے اتنا وقت کہاں سے مل سکتا ہے! اصرار پہ اصرار کرتے چلے جاتے ہو۔ اچھا بابا! تم جیتے۔ میں ہارا۔ والسّلام

پرویز

حقائق و عبر

بھولے ہوئے کی یاد

باتش بخیر جناب راشٹرپتی ابوالکلام صاحب آزاد کچھ ایسے ذہن سے اترے کہ مدت سے ان کا ذکر ہی نہیں آسکا۔ اب بھی ان کی یاد نہ آتی اگر مسٹر مہادیو ڈیسائی ہندوستان ٹائمز کے سالنامہ میں جناب آزاد کے کوائف حیات درج نہ فرماتے مسٹر ڈیسائی کے مضمون میں دو ایک باتیں ایسی دلچسپ ہیں جن میں قارئین طلوع اسلام کو شریک نہ کرنا بخل سا معلوم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ جناب مولانا صاحب کھادی کے بہت گرویدہ ہیں چنانچہ چرخہ کے مقاصد عظمیٰ اور کھادی کے منافع عالیہ کے متعلق مولانا صاحب کا ایک دلپذیر وعظ درج کیا گیا ہے جس کے مقطع میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ موجودہ مشکلات و مصائب کے لئے "کھادی کو عالمگیر بنانے کے سوا ہمارے پاس کوئی اور علاج نہیں" بہت اچھا! لیکن اس وعظ کو درج کرنے کے بعد مسٹر ڈیسائی تحریر فرماتے ہیں۔

لیکن بایں ہمہ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا صاحب کی وضعداری انہیں کبھی اجازت نہ دے گی کہ وہ خود بھی کسی گاؤں میں بیٹھکر چرخہ کاتنے لگ جائیں۔ اور سچ تو یوں ہے کہ مولانا صاحب خود بھی اس (حقیقت) سے واقف ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ بہت کم لیڈر ایسے ہونگے جو مولانا صاحب سے زیادہ اپنی حدود سے باخبر ہوں "

مسٹر ڈیسائی کیا خوب سمجھے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو حیرت ہو کہ یہ جاننے کے باوجود کہ چرخہ کے متعلق مولانا صاحب کی عملی زندگی ایسی ہے۔ انہیں کس طرح کانگرس کا راشٹرپتی بنا دیا گیا جس کی بنیاد چرخہ اور کھادی پر ہے لیکن اس میں تعجب کی کونسی بات ہے! ہمارا تو خیال ہے کہ مولانا صاحب کا خود کانگرس کے متعلق بھی وہی عالم ہے جو چرخہ اور کھادی کے متعلق ہے۔ بایں ہمہ ہندوان کے خلاف ایک لفظ زبان تک نہیں لاتے گئے کہ انہوں نے مولانا صاحب کو اس لئے تھوڑا سا تو رکھا ہے کہ وہ کانگریس کے نصب العین کے فدائی ہیں انہوں نے تو دنیا کو فریب دینے کے لئے انہیں ساتھ چمٹا رکھا ہے کہ کانگرس ہندوؤں کی جماعت نہیں۔ ہندو مسلم سب کی مشترکہ جماعت ہے۔

اس کے بعد مسٹر ڈیسائی اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ مولانا صاحب، جناب گاندھی کے اس قدر گرویدہ کیوں ہو گئے۔ فرماتے ہیں۔

میں نے مولانا صاحب سے پوچھا کہ گاندھی جی سے ان کی گہری عقیدت کی بناء کیا ہے؟ انھوں نے کہا۔ گاندھی جی کے عظیم الشان تدبر کے علاوہ۔ ان کی خالص صداقت نے انہیں (مولانا صاحب کو) گاندھی جی کا گرویدہ بنا رکھا ہے ۱۹۲۶ء تک میں انھیں کم و بیش ناقدانہ نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ اس زمانے میں میں نے گاندھی جی کا ایک مضمون پڑھا جو انھوں نے ینگ انڈیا میں شائع کیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ گاندھی جی کی دھرم پتنی کو کہیں سے کوئی چیز تحفتہً ملی۔ قاعدہ کی رو سے وہ چیز آشرم کے منیجر کے پاس پہونچا دینی چاہیئے تھی لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ اس پر گاندھی جی نے اپنی بیوی پر سخت تنقید کی۔ مولانا صاحب نے کہا کہ۔ اس پر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ "ہاں! یہ ہے وہ انسان جس کی صداقت کے متعلق اس کا دشمن بھی شبہ نہیں کر سکتا۔ اور میں حیران تھا کہ گاندھی جی اپنی صداقت میں کہاں تک جا پہونچے ہیں"

ملاحظہ فرمایا آپنے وہ مافوق الفطرت واقعہ جس سے متأثر ہو کر جناب راشٹرپتی صاحب گاندھی جی کے گرویدہ ہو گئے۔ ہمیں اس وقت تک مولانا صاحب کی ذہانت کے متعلق بڑی خوش فہمی تھی۔ لیکن اس واقعہ سے وہ بھی ختم ہو گئی۔ ہم سمجھتے تھے کہ مولانا صاحب نے باطنی فرقوں کے بڑے بڑے "حسن بن صباح" تاریخ میں دیکھے ہوں گے۔ اس لئے ان کے نزدیک اس امر کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ ہو گا کہ اگر یہ واقعہ آشرم کے اندر ہوا بھی ہو۔ تو بھی ساری دنیا میں اس کا یوں ڈھنڈورا پیٹنا۔ چہ معنی دارد! اور پھر کیا یہ واقعہ ایسا ہے کہ جس سے متأثر ہو کر انسان اپنے نظریاتِ زندگی کو چھوڑ۔ اپنی ملّت کو تیاگ۔ متاعِ دین و دانش کے سرمایہ کو لے کر

رفتم و نثارِ بت پرستے کردم

کی مثال پیش کر دے۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ بات کچھ اور ہوئی۔ مسٹر ڈیسائی نے سوال بے ڈھب سا کر دیا جس کے جواب کے لئے مولانا صاحب نے پہلے سے کچھ سوچا نہیں تھا۔ یہ بھی ان کی ذہانت تھی کہ انہوں نے برمحل جواب تیار کر لیا اور ڈیسائی صاحب نے اسے سچ سمجھ کر نقل کر دیا۔ یار لوگوں کو ایسی باتیں اللہ دے۔

اس کے بعد مضمون میں ترجمان القرآن اور مولانا صاحب کے فلسفۂ مذہب کے متعلق بڑی محققانہ، بحث کی گئی ہے۔ وہی رسوائے عالم اکبر کا دینِ الٰہی۔ سب مذاہب سچائی کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ خدا پرستی اور نیک عملی یہ ہے صحیح مذہب۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس میں ڈیسائی صاحب کو ایک مشکل پیش آگئی۔ یہ اشکال اور اس کا جواب کیا ہے۔ خود ڈیسائی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ تحریر ہے۔

کیا مولانا صاحب اس امر کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ کسی ایک مذہب والوں کے لئے یہ جائز ہے کہ دوسرے مذہب کے پیروؤں پر غلبہ حاصل کرلیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ مولانا صاحب نے ۱۹۲۲ء میں عدالت میں بیان دیتے ہوئے "غلبۂ اسلام" کے الفاظ استعمال کئے تھے لیکن ان کی تفسیر سے اس ترکیب کا مفہوم بالکل واضح ہوگیا ہے۔ انہوں نے اس چیز کو واضح طور پر بیان کردیا ہے کہ "لفظ اسلام کے معنی صداقت پر ایمان اور اس کے مطابق عمل" کے ہیں قرآن یہ بتاتا ہے کہ ہر جگہ مذہب کی روح ایک ہی ہے یعنی خدا کے راستہ پر چلنا حق و صداقت کی یہ راہ صرف نوع انسانی کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام عالم فطرت کے لئے ہے" اس لئے غلبۂ اسلام کے معنی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ دنیا میں ان کا غلبہ ہو جن کے خیالات الفاظ اور اعمال۔ خدا کی تسلیم و رضا کے مظہر ہوں۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ وہ لوگ جو خدا کی بادشاہت اور نیکی کو تسلیم کرتے ہوں"

یہ ہے وہ "توبہ نامہ" جو مولانا صاحب کی طرف سے اس الزام کے جواب میں پیش کیا گیا ہے کہ انھوں نے ۱۹۲۲ء میں یہ کہہ دیا تھا کہ میں غلبۂ اسلام کا قائل ہوں۔ راشٹرپتی اور غلبۂ اسلام! توبہ توبہ

یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

(۲) وہ بھی مان گئے

سندھ کے مشہور "ترسکاری" مرحوم آزاد کانفرنس کے زندہ صدر۔ خان بہادر اللہ بخش صاحب نے پچھلے دنوں سندھ میڈیکل یونین کو مخاطب کرتے وقت فرمایا۔

"مسلم لیگ نے کم از کم ایک بات ضرور پیدا کردی ہے یعنی اس نے مسلمانوں کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے منظم کردیا ہے اس سے دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ

گفت و شنید کرنے میں سہولت ہوگئی ہے۔ (اسٹیٹس مین ۲۲ ۳/۴)

سنا آپ نے! یہ خان بہادر صاحب غیر شعوری طور پر کیا کہہ گئے! ان سے پوچھئے کہ جب مسلم لیگ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے منظم کر دیا ہے جو اس قابل ہے کہ دوسری سیاسی جماعتوں سے گفت و شنید کرنے میں مسلمانوں کے ترجمان و نمایندہ سمجھی جائے۔ تو آپ حضرات کن کے نمائندے ہیں! کبھی کبھی نا سمجھی" میں سچی بات یوں زبان سے نکل جاتی ہے جس کے بعد ہزار بار "یا اللہ میری توبہ" کہنا پڑتا ہے اور خلوت میں نہ معلوم ان باتوں کا کفارہ کس قدر دینا پڑتا ہوگا۔!

---

(۳) بر وقت و پر لطف

مسٹر جناح کی حاضر جوابی ضرب المثل ہے۔ اور ایک مرد دانا و زیرک کو ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے ورنہ "مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلہ خود باید زد" قسم کے لوگ تو مارے مارے پھرتے ہیں۔ پچھلے دنوں اسمبلی میں مسٹر انینے نے کہا کہ۔

"مجھے امید ہے کہ اگر مسٹر جناح اور کانگریس اور دوسرے حضرات کہیں سر جوڑ کر بیٹھ جائیں اور موجودہ صورتِ حالات کے لئے کوئی مشترکہ حل سوچیں تو ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی ضرورت ہی نہ پیش آئے"

ہنوز آخری لفظ مسٹر انینے کی زبان سے جدا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مقابل سے مسٹر جناح نے ان کے فقرہ کو یوں پورا کر دیا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ مطالبۂ پاکستان کو تسلیم ہی کر لیا جائے" (مسلم و ایس ۱۹ ۲/۴)

عین وقت پر اس قسم کی کاٹ جو اثر کر جاتی ہے اس کا اندازہ اربابِ نظر ہی لگا سکتے ہیں؟

---

(۴) صرف دوسروں کی زبانی

سرگودھا کے فساد کے سکھ ملزموں کی رہائی کے متعلق جو فیصلہ ہوا ہے ہم اس کے متعلق اپنی طرف سے ایک لفظ لکھنا تضیع اوقات اور تحصیل حاصل سمجھتے ہیں۔ البتہ دو ایک باتیں محض دوسروں کی زبانی بیان کیجاتی ہیں۔

ایسٹرن ٹائمز نے اس فیصلہ سے پیشتر لکھا تھا۔

"لیکن سرگودھا کے مطالبہ کے متعلق (حکومت کو) کبھی نہیں جھکنا چاہیئے۔ سکھ ملزمین کے

خلاف الزام یہ ہے کہ انہوں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ان احکام کی خلاف ورزی کی جو اس نے یورپین سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ایماء سے نافذ کئے تھے وزیراعظم اور حکام ضلع ملزمین کو اس شرط پر رہا کرنے پر آمادہ ہیں کہ وہ اپنے مبینہ مفسدانہ رویہ کے متعلق اظہار افسوس کریں اکالی لیڈروں کا یہ مطالبہ کہ چونکہ ان ملزموں نے جو کچھ کیا مذہبی جذبات سے متاثر ہو کر کیا اس لئے انہیں بلا شرط چھوڑ دیا جائے۔ سراسر غیر معقول ہے۔ اگر اس مطالبہ کو کلیتہً تسلیم کر لیا گیا تو قانون اور ضابطہ شکنی کے لئے ایک سند مل جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ چیز کئی اور اعتبارات سے بھی نازک نتائج کی حامل ہوگی۔ اگر سرگودہا کے سکھ مذہبی جذبات سے مشتعل ہوئے تھے۔ تو خاکساروں کی بھی یہی صورت تھی جنہیں سینکڑوں کی تعداد میں اواخر ۱۹۳۹ء اور اوائل ۱۹۴۰ء میں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور گرفتار کیا گیا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت کوئی ایسا اقدام نہیں کرے گی جس سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ حکومت مسلمانوں کے معاملہ میں ایک قسم کا رویہ اختیار کرتی ہے اور اکالیوں کے لئے دوسری قسم کا۔ اس مقام پر حکومت نے اگر استقلال سے کام لیا تو یہ چیز اسے مستقبل کی بہت سی مشکلات سے بچا لے گی" (ایسٹرن ٹائمز مورخہ ۲۸ [illegible])

اس کے بعد سرگودہا کے ملزمین کو رہا کر دیا گیا اور بتایا گیا کہ

"پرسوں سرگودہا کے سکھوں کا ایک وفد ڈپٹی کمشنر کے روبرو پیش ہوا اور مطلوبہ یقین دلا دیا ڈپٹی کمشنر نے گرفتار شدہ آدمیوں کے خلاف مقدمات واپس لے لئے اور انہیں رہا کر دیا"

(انقلاب مورخہ ۱ ۴/۴۱)

خبر انقلاب کے صفحہ ۳ پر ہے اور اسی پرچہ کے صفحہ ۸ پر یہ خبر درج ہے۔

"ماسٹر تارا سنگھ نے بھی ایک بیان جاری کیا ہے جس میں سرگودہا کے سکھوں کی رہائی اور جلوس کے راستہ کے متعلق گورنمنٹ کے اعلان پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ سرگودہا کے سکھوں نے اظہار افسوس نہیں کیا اور نہ حکام کو کوئی یقین دلایا ہے"

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اقبال کا تصورِ خودی

(از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب)

(ہم نے مارچ ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ حضرت علامہ رح کے پیغام سے متعلق اہم مضامین جو دوسرے رسائل میں شائع ہوں اور مفید نظر آئیں ۔ طلوعِ اسلام میں بھی شائع کئے جایا کرینگے ۔ اس سلسلہ کا پہلا مضمون اُس اشاعت میں شائع ہوا تھا ۔ زیرِ نظر مضمون جو رسالہ "اُردو" میں شائع ہوا تھا بہ تشکر یہاں شائع کیا جاتا ہے ۔ "طلوعِ اسلام")

اگر آپ کسی سے پوچھیں کہ اقبال کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے تو وہ یہی کہے گا کہ ان کی شاعری فلسفیانہ شاعری ہے ۔ یہ سُن کر شاید آپ کے ذہن میں اُلجھن پیدا ہو کہ بھلا فلسفہ شعر کیونکر ہو سکتا ہے ۔ فلسفہ تو حقیقت کی خشک اور بے جان تعبیر ہے اور شعر اس کی زندگی سے جھلکتی ہوئی تفسیر ۔ فلسفی صورتِ کائنات کا ذہنی ادراک کرتا ہے اور اپنے ادراکات کو مجرد تصورات میں بیان کر دیتا ہے جو ہماری لوحِ فکر پر درج ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ بہ خلاف اس کے شاعر نبضِ کائنات کی تڑپ، قلبِ حیات کی دھڑکن کو محسوس کرتا ہے اور اپنے احساسات کو متحرک نقش اور نغمے میں ادا کرتا ہے جو ہمارے دل میں اُتر کر خون کے ساتھ گردش کرنے لگتا ہے ؎

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

کیا اقبال کے شعر کو فلسفیانہ شعر کہنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ حکمت کے نظریات کی طرح سوز و درد، زندگی اور حرکت سے خالی ہے ؟

جسے اقبال کے کلام سے ذرا سا بھی مس ہے وہ جانتا ہے کہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ۔ اقبال کی شاعری تو آبِ حیات کا خزانہ ہے جس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے اُبلتے ہیں جن سے سیراب ہو کر یاس دلوں کی خشک اور بنجر زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور امید کی کھیتی لہلہانے لگتی ہے ۔

بات یہ ہے کہ جب شعر کے لئے فلسفے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو فلسفے کی صرف ایک ہی صنعت مدِ نظر ہوتی ہے یعنی موضوع کی کلّیت اور ہمہ گیری۔ اقبال کا کلام فلسفیانہ اسی معنی میں ہے کہ وہ ایک کلی تصورِ حیات پیش کرتا ہے۔ اس کا موضوع فرقہ اور ملت کی زندگی کا ایک جامع نصب العین ہے جسے ہم فلسفۂ تمدن کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ اگر طرزِ ادا کو دیکھیے تو وہ اُسی سوز و گداز، رنگ و آہنگ سے لبریز ہے جو ایشیائی شاعری کی جان ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اقبال کا خطاب انسانوں کی صرف ایک جماعت یعنی مسلمانوں سے ہے، کُل نوعِ انسانی سے نہیں، ان کے پیشِ نظر ملت کا نصب العین ہے جو انسانیت کے مقابلے میں بہت تنگ اور محدود ہے۔ اس سے زیادہ وسیع مشرب تو ہندوستان اور ایران کے غزل گو شاعروں کا ہے جو عام انسانی زندگی کے جذبات و کیفیات کے مصور ہیں۔ مگر ذرا غور سے دیکھیے تو محض جذبات و کیفیات کی مصوری اور چیز ہے اور زندگی کے ایک مکمل تصور کی تعمیر اور چیز ہے۔ جذبات کل انسانوں میں یکساں ہیں لیکن نصب العین حیات کی تشکیل میں اختلاف پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ایک عالمگیر انسانی تمدن کا خیال ہر زمانے میں بعض لوگوں کے پیشِ نظر رہا ہے اور اب بھی ہے۔ لیکن محض مجرد تصور یعنی فلسفے کی شکل میں۔ اس تصور کو کسی ایک شخص کے قلب سے بھی وہ زندہ تعلق پیدا نہیں ہوا جو اسے موضوعِ شعر بنانے کے لئے ضروری ہے۔ اب تک ہر شاعر اس پر مجبور رہا ہے کہ انسانیت کا عکس کسی خاص ملت یا قوم کے آئینے میں دیکھے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم اور ملت کے تصورات میں کون زیادہ وسیع ہے اگر آپ قوم سے اہلِ مغرب کی اصطلاح میں وہ جماعت مراد لیں جس میں قدرِ مشترک محض نسل اور وطن ہے اور ملت اقبال کے محاورے میں اس گروہ کو کہیں جس کے لئے ایک روحانی اور اخلاقی نصب العین رشتۂ اتحاد کا کام دیتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ملت کے تصور کا وسیع تر اور انسانیت سے قریب تر ہونا ممکن ہے۔ اس لئے کہ نسل و وطن کا فرق دنیا میں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اگر اس پر زیادہ زور دیا جائے تو نوعِ انسانی میں اتحاد پیدا ہونا محال ہے۔ لیکن ایک اخلاقی اور روحانی نصب العین کا کل انسانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے متحد کر دینا کم سے کم خیال میں آ سکتا ہے[1]۔ دیکھنا اصل میں یہ ہے کہ جو نصب العین اقبال کے ذہن میں ہے وہ کیا ہے اور کیسا ہے۔ محض یہ بات کہ وہ ملت کے تصور سے وابستہ ہے

---

[1] صرف خیال ہی میں نہیں آ سکتا بلکہ ایک حقیقت ہے جس کی طرف دنیا چاروں طرف سے گھبرا کر پناہ جوئی کے لئے آمادہ نظر آتی ہے۔ "طلوعِ اسلام"

اُسے تنگ اور محدود کہنے کے لئے کافی نہیں۔

اقبال کی شاعری اور اُن کے نصب العین زندگی کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس نقش کو اُس کے تاریخی پس منظر کے ساتھ دیکھیں۔ جب اُفقِ ہند سے وہ ہلالِ نو نمودار ہوا جو ایک دن فلکِ شعر پہ ماہِ کامل بن کر چمکنے والا تھا، اس وقت عموماً مشرق اور خصوصاً عالمِ اسلام پر حزن ویاس کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سب سے بد تر حالت ہندستان کے مسلمانوں کی تھی۔ جہل اور غلامی کی بدولت ان کے دلوں میں زندگی کی آگ سرد پڑ چکی تھی اور جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھئے راکھ کے ڈھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مغربی فاتحوں کی ہیبت، مغربی تمدن کی صولت مسلمانانِ ہند کے قلب و دماغ پر مستولی تھی۔ وہ اس بے پناہ قوت سے ڈر کر بھاگنا چاہتے تھے مگر یہ مقناطیس کی طرح انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس زمانے میں ایک باہمت، خود دار اور مدبر مسلمان سید احمد خاں نے جسے یقین تھا کہ ملتِ اسلامی کی سطحی کمزوری کی تہ میں فولاد کی قوت پنہاں ہے، مسلمانوں کو اس پر اُبھارا کہ وہ بے تکلف اپنی زندگی کو مغربی تمدن سے رگڑ کھانے دیں۔ اس رگڑ سے ابتدا میں انہیں سخت صدمہ پہنچا، مگر اسی سے وہ چنگاریاں بھی نکلیں جنہوں نے اُن کے دلوں میں غیرت و حمیت کی آگ بھڑکا دی۔

تدبیرِ سیاست کو چھوڑ کر صرف شعر کے میدان کو دیکھئے تو آپ کو دو ممتاز صورتیں نظر آئیں گی جنہوں نے مسلمانوں کے مرعوبی اور مایوسی کے طلسم کو توڑا اور اُن میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ایک 'حالی' جس نے سوز و درد کے لہجے میں ملتِ اسلامی کو اس کے عروج و زوال کی داستان سنا کر گذشتہ عظمت و اقبال کی یاد تازہ کر دی اور موجودہ پستی و نکبت پر غیرت دلائی۔ دوسرے 'اکبر' جس نے ظرافت کے پیرائے میں مسلمانوں کو غیروں کی ذہنی غلامی کی ذلت سے آگاہ کیا اور ان کی نظر میں اپنے مذہب و تمدن کا احترام دوبارہ قائم کر دیا۔ حالیؔ جدت پسند تھے، قدیم تہذیب کی خرابیوں پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے اور جدید تہذیب کی خوبیوں کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ اکبرؔ قدامت پسند تھے، نئی روشنی کی ہر چیز پر ہنستے تھے اور پُرانی روشنی کی ہر چیز کو سراہتے تھے۔ مگر دونوں نے مسلمانوں میں عزتِ قومی کے جذبے کو اُبھارا۔ اپنی مدد آپ کرنے کا حوصلہ دلایا۔ اور یاس کی تاریکی میں اُمید کی ایک جھلک دکھائی۔

لیکن ان دونوں بزرگوں کی نظر بات کی تہ تک نہیں پہنچی۔ انہوں نے بیمار قوم کا مرض تو تشخیص کر لیا لیکن اس مرض کا

سبب نہیں پہچان سکے ۔ اکبرؔ نے مسلمانوں کے تنزل کا باعث یہ قرار دیا کہ وہ اپنے مرکز یعنی مذہب سے منحرف ہو گئے اور حالیؔ نے یہ کہا کہ وہ اجتہاد فکر اور وسعت نظر چھوڑ کر تقلید پرست اور تنگ خیال بن گئے ۔ مگر دونوں میں سے کسی نے یہ نہ بتایا کہ آخر ان کے مرکز سے منحرف ہونے یا تقلید و تعصب اختیار کر لینے کی وجہ کیا تھی ۔ اس وجہ کے معلوم کرنے کے لئے اقبال کی فلسفیانہ نگاہ کی ضرورت تھی ۔ شاید مورخ یہ کہے کہ دولت اور حکومت نے مسلمانوں کو کاہل اور عیش پرست بنا دیا اور اسی کاہلی اور عیش پرستی نے انہیں رفتہ رفتہ فعالیت اور حرکت سے محروم کر کے انفعالیت اور جمود میں مبتلا کر دیا ۔ لیکن اقبال، جس کی نظر تاریخ کے ساتھ ساتھ فلسفۂ تمدن اور فلسفۂ نفس پر بھی عبور رکھتی تھی[1] اس توجیہ کو کافی نہیں سمجھتے تھے ۔ وہ جانتے تھے کہ ایک اُولوالعزم قوم میں، جس نے اپنی عظمت و سطوت کا سکہ دنیا پر بٹھا دیا ہو، جسمانی تعیش اور کاہلی کی لہر جب تک اس کے اندر روحانی تعیش اور کاہلی کا زہر نہ بھرا ہو، ہرگز اس حد تک نہیں پہنچ سکتی کہ اس کے قوائے ذہنی اور عملی کو ماؤف کر دے ۔ یہ روحانی تعیش اور کاہلی اقبال کے نزدیک وحدت وجود کے عقیدے پر مبنی ہے جو مسلمانوں میں غیر اسلامی اثرات سے پیدا ہوا اور جس نے انفرادی نفس کے وجود کو باطل قرار دے کر ان کے دلوں سے فرد کی اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو مٹا دیا اور اس طرح مذہب و اخلاق کی جڑ کو کھوکھلا کر دیا اور سعی و عمل کے ذوق کو فنا کر دیا ۔ اس اجمال کی تفصیل خود اقبال کی زبان سے سنئے :-

" مسئلۂ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نکتۂ خیال سے شیخ محی الدین عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے ۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلۂ وحدت الوجود کو جس کے وہ ان تھک مفسر تھے، اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا ۔ اوحد الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعرا اس رنگ میں رنگین ہو گئے ۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے ۔ انہوں نے جزو و کل کا دشوار گزار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے "رگِ چراغ"

---

[1] سب سے بڑھکر قرآن پر کیونکہ قرآن کے بغیر فلسفۂ تمدن اور فلسفۂ نفس پر عبور اس صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی نہیں کر سکتا جس کی طرف اقبال کا پیغام لے جاتا ہے ۔ "طلوعِ اسلام"

میں "خونِ آفتاب" اور "شرارِ سنگ" میں "جلوۂ طور" کا مشاہدہ کیا۔"

"مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے مسئلۂ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی اُنھوں نے دل کو اپنا آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخرکار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچکر تمام اسلامی قوم کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔"

وحدتِ وجود کا مسئلہ جس کی طرف مندرجۂ بالا عبارت میں اشارہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ وجودِ حقیقی صرف خالقِ کائنات کی ذات کا ہے۔ مخلوق جس میں عالمِ طبیعی اور انسان سب ہی داخل ہیں، محض اعتباری اور موہوم وجود رکھتے ہیں اور اسی ایک نورِ ایزدی کے پرتو ہیں ہم نے اپنی کوتاہ بینی سے ان اصنامِ خیالی کو حقیقی سمجھ لیا ہے اور تعینات کے ان پردوں نے ہمیں معرفتِ ذات سے محروم کر دیا ہے ؎

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے (غالب)

اصل میں یہ احساسِ وحدت ایک کیفیت ہے جو قلبِ حال پر ایک خاص وقت میں آناً فاناً گزر جاتی ہے مگر جب زبانِ قال اسے تصورات کے جال میں پکڑ کر رکھنا چاہتی ہے تو الفاظ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ انہی الفاظ کو شاعر لے اُڑتے ہیں اور نظم کا خوشنما لباس پہنا کر اس قدر دلکش اور دلفریب بنا دیتے ہیں کہ سُننے والوں کا دل و دماغ مسحور ہو جاتا ہے۔ یہی وہ تصوف ہے جس کے متعلق شیخ علی حزیں نے کہا ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" اگر یہ قیل و قال محض تفریح کے لئے ہو تو کوئی حرج نہیں، مگر غضب تو یہ ہے کہ جو قوم عیش و عشرت میں پڑ کر زندگی کی کٹھن ذمہ داریوں سے گھبرانے لگتی ہے اور ان سے بچنے کا حیلہ ڈھونڈھتی ہے وہ اس متصوفانہ شاعری کو اپنا فلسفۂ حیات بنا لیتی ہے۔ کائنات کا موہوم ہونا، نفسِ انسانی کا بے حقیقت اور زندگی کا بے ثبات ہونا، سعی و عمل کا لاحاصل ہونا وہ خیالات ہیں جو شعر کے میٹھے سُروں میں تھکی ہوئی قوم کو لوریاں دے کر سُلا دیتے ہیں۔ پھر جب اپنی غفلت کی بدولت وہ دولت و حکومت قوت و اقتدار کھو بیٹھتی ہے تو یہی دلفریب نغمے جو پہلے صبر و سکون اور

کیف و سرور کا سبب ہوتے تھے' اب قنوت و یاس اور حزن و ملال کا باعث بن جاتے ہیں اور اسے ایک بار گرنے کے بعد پھر اٹھنے نہیں دیتے۔ یہی ماجرا تھا جو مسلمانوں پر گزرا اور جس نے ان میں بے مرکزی، بے اصولی اور بے عملی پیدا کر دی مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی امراض کا یہی سب سے بڑا سبب تھا جسے حکیم ملت اقبال نے پہچانا اور جس کے ازالے کی کوشش میں انہوں نے اپنی مسیحائی کی خداداد قوت صرف کی۔

اس عقیدے کو جو اقبال کے نزدیک ملتِ اسلامی کے زوال کی حقیقی وجہ ہے وہ "نفی خودی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسے "اثباتِ خودی" کے نظریے سے رد کرنا چاہتے ہیں۔ خودی یا انانیت کا لفظ اردو میں کبر و غرور کے معنوں میں آیا کرتا ہے مگر اقبال نے اسے ایک فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر اس احساس اور عقیدے کے لئے استعمال کیا ہے کہ فرد کا نفس یا انا، گو ایک مخلوق اور فانی ہستی ہے، لیکن یہ ہستی اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پائیدار اور لازوال ہو جاتا ہے۔ اسرارِ خودی کے دیباچے میں فرماتے ہیں: "یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے' اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعیینِ ذات ہے۔"

یہی خودی کا تصور اقبال کے فلسفۂ حیات و کائنات کی بنیاد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فلسفے کا آغاز ایک حیرت اور الجھن سے ہوتا ہے۔ وہ سوال جس نے اقبال کو الجھن میں ڈالا یہ ہے "یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی جذبات و تخیلات مستنیر ہوتے ہیں؛ یہ پُراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کا شیرازہ بند ہے' یہ 'خودی' یا 'انا' یا 'میں' جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے' جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت نگاہوں کے گرم مشاہدے کی تاب نہیں لا سکتی' کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنے فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغِ مصلحت آمیز میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد اور اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے علما اور حکما نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر کہ ان کی اُفتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجہ کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریبِ تخیل

ہے اور اس پھندے کو گلے سے اُتارنے کا نام نجات ہے ۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جن کے لئے ان کی فطرت متقاضی تھی .... مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک ایک نہایت زبردست پیغامِ عمل تھی گو اس تحریک کے نزدیک " انا " ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے .... میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو "

آئیے اب یہ دیکھیں کہ جس خیال کو اقبال نے یہاں مجمل طور پر نثر میں بیان کیا ہے اس کی تفصیلات اس باکمال سخنور کے فیضِ طبع سے شعر کا جامہ پہن کر کس قدر دل نشیں اور دل آویز ، روح پرور اور روح افزا ، جاں نواز اور جاں بخش بن جاتی ہیں ۔

اقبال کے نزدیک کائنات کی اصل ایک وجودِ بسیط ہے جس کے اندر شعور اور ارادے کی قوتیں مضمر ہیں ۔ ان قوتوں کو فعل میں لانے کے لئے اس نے آپ کو خود اور غیر خود یا فلسفے کی اصطلاح میں موضوع اور معروض میں تقسیم کر دیا ۔ غیر خود کی علتِ غائی یہ ہے کہ وہ خودی کے مشاہدے کے لئے آئینے کا اور اس کے عملِ ارتقا کے لئے معمول کا کام دے ۔ خودی اپنی تکمیل اور استحکام کے لئے غیر خود سے ٹکراتی ہے اور اسی تصادم کے ذریعے سے اس کی اندرونی قوتیں نشوونما پاتی ہیں اور وہ بتدریج سلسلۂ ارتقا کو طے کرتی ہے ۔ اس کی ہستی مسلسل حرکت اور عملِ پیہم ، کشمکش اور کارزار ہے ۔ جس نسبت سے کوئی شے اپنی خودی میں مستحکم اور غیر خود پر غالب ہے اُسی نسبت سے اس کا درجہ مدارجِ حیات میں متعین ہوتا ہے ۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — غیرِ او پیداست از اثباتِ او
سازد از خود پیکرِ اغیار را — تا فزاید لذتِ پیکار را
چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است — پس بقدرِ استواری زندگی است

چوں زمیں بر ہستیِ خود محکم است | ماہ پابندِ طوافِ پیہم است
ہستیِ مہر از زمیں محکم تر است | پس زمیں مسحورِ چشمِ خاور است

اس سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی انسان ہے ؎

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات | خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے | نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی | ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر | ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے | فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

مخلوقات میں بہ اعتبار مدارج انسان اسی لئے سب سے برتر ہے کہ اس کی ذات میں خودی کو اپنا اور اپنے مقصد کا شعور حاصل ہو جاتا ہے اور یہی شعور اسے اور سب چیزوں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ بھی اور مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہے مگر اس کی ہستی محض اعتباری نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اس کے مقابلے میں عالمِ فطرت کا وجود محض اضافی اور انسانی ادراک و مشاہدے کا پابند ہے ؎

ایں جہاں چیست صنم خانۂ پندارِ من است | جلوۂ او گروِ دیدۂ بیدارِ من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے او را | حلقہ ہست کہ از گردشِ پرکارِ من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من | چہ زمان و چہ مکاں شوخیِ افکارِ من است

جہاں را فربہی از دیدنِ ما | نہالش رستہ از بالیدنِ ما
جہاں غیر از تجلی ہائے ما نیست | کہ بے ما جلوۂ نور و صدا نیست
جہانِ رنگ و بو گلدستۂ ما | ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما

خودی او را بہ یک تار نگہ بست / زمین و آسمان و مہر و مہ بست

بقول ڈیکارٹ کے انا یا خودی کی ہستی بدیہی ہے اس لئے کہ اسے بلا واسطہ اپنا شعور ہوتا ہے درانحالیکہ غیر خود یعنی عالمِ فطرت کی ہستی دلیل کی محتاج ہے۔ اگر انسان کو اپنے وجود میں شک ہو تو یہ شک خود اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی شک کرنے والا موجود ہے ؎

اگر گوئی کہ "من" وہم و گمان است / نمودش چوں نمودِ این و آن است
بگو با من کہ دارائے گماں کیست / یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست
جہاں پیدا و محتاجِ دلیلے / نمی آید بہ فکرِ جبرئیلے
خودی پنہاں ز حجت بے نیاز است / یکے اندیش و دریاب ایں چہ راز است
خودی را حق بداں باطل مپندار / خودی را کشتِ بے حاصل مپندار

جس طرح انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اپنی خودی کا شعور ہے اسی طرح اس کی منزلِ مقصود یہ ہے کہ خودی کو روز بروز مضبوط اور مستحکم کرتا جائے جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں، خودی کے استحکام کی یہی صورت ہے کہ انسان غیر خود سے یعنی اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرتا رہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے لئے نئے نئے مقاصد متعین کرتا ہے اور انہیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم رہتا ہے۔ اس میں اسے اپنے ماحول میں تصرف کرنا، اپنی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرنا اور مشکلات کا مقابلہ کرکے ان پر غالب آنا پڑتا ہے۔ اس طرح اس کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی رہتی ہیں اور اس کے سینے میں خودی کی آگ روز بروز زیادہ مشتعل ہوتی جاتی ہے ؎

زندگانی را بقا از مدعاست / کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است / اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا / سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم / از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

یہ سوزِ آرزو و طلب خودی کو دم بھر چین نہیں لینے دیتا۔ ایک مقصد کے حاصل ہوتے ہی وہ ایک بلند تر مقصد کے حصول کی کوشش کرنے لگتا ہے اور اسی طرح راہِ طلب میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی بیقراری اور بے چینی، اسی سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل کا نام زندگی ہے۔ سکون خواہ وہ بہشت ہی کا سکون کیوں نہ ہو، روحِ انسانی کیلئے موت کا پیام ہے۔

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد — دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے — تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
زِ شرر ستارہ جویم زِ ستارہ آفتابے — سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
چو زِ بادۂ بہارے قدحے کشیدہ خیزم — غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نو بہارے
دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے — نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

خودی کے منازلِ ترقی اس عالمِ زمان و مکاں کی تسخیر پر ختم نہیں ہوتے۔ شاعر کی چشمِ تخیل انسان کے جہد و عمل کیلئے اس کے ماورا نئے نئے میدان دیکھتی ہے ؎

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اس راہ میں ایک رہنما کی ضرورت ہے اور وہ رہنما عشق[1] ہے۔ عشق اس مردِ کامل کی محبت کو کہتے ہیں جو معرفتِ نفس کے مدارج سے گزر کر خودی کی معراج پر پہنچ چکا ہے۔ محبت کا دوسرا نام تقلید ہے لیکن یہاں عشق اور تقلید کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عاشق اپنے آپ کو معشوق کی ذات میں یا مقلد اپنے آپ کو مرشد کی ذات میں کھو دے یا اس سے روحانی قوت مستعار لیکر مصنوعی تقویت حاصل کرلے بلکہ یہ ہیں کہ وہ اس برتر شخصیت سے تکمیل خودی کا راز سیکھے اور خود اپنی قوتوں کو نشوونما دے کر اپنی شخصیت یا خودی کو استوار کرے ؎

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است　　زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پایندہ تر　　زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے　　بوسہ زن بر آستانِ کاملے
کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق　　ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
عاشقی محکم شو از تقلیدِ یار　　تا کمندِ تو شود یزداں شکار

خام کاروں کو عشق خود فراموشی اور از خود رفتگی سکھاتا ہے مگر پختہ کاروں کو خود شناسی اور خودداری کا سبق دیتا ہے ؎

بہر دل عشق رنگِ تازہ بر کرد　　گہے با سنگ و گہ با شیشہ سر کرد
ترا از خود ربود و چشم تر داد　　مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

ایک لافانی نصب العین کی محبت فانی انسان کی خودی کی تکمیل کر کے اسے بھی لازوال بنا دیتی ہے ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ　　عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو　　عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا　　اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

---

[1] حضرت علامہ کے کلام میں عشق محبت۔ مردِ کامل۔ تقلید وغیرہ خاص اصطلاحات ہیں جن کی تشریح و تفسیر خود انہی کے ہاں مل سکتی ہے۔ ان اصطلاحات کے مفہوم کے لئے عام سطح سے بہت بلند ہونا پڑے گا۔ "طلوعِ اسلام"

طلبِ ہدایت کے لئے کسی مردِ کامل کے آگے سرِ نیاز[لہ] جھکانا تو خودی کو مستحکم کرتا ہے لیکن مال و دولت، جاہ و منصب کے لئے اربابِ اقتدار کا دست نگر ہونا اسے ضعیف کر دیتا ہے۔ فقر و استغنا خودی کی سب سے اہم شرط ہے ؎

اے فراہم کردہ از شیراں خراج — گشتۂ روبہ مزاج از احتیاج
از سوال افلاس گردد خوار تر — از گدائی گدیہ گر نادار تر
از سوال آشفتہ اجزائے خودی — بے تجلی نخلِ سینائے خودی
وائے بر منت پذیرِ خوانِ غیر — گردنش خم گشتۂ احسانِ غیر
اے خنک، آں تشنہ کاندر آفتاب — می نخواہد از خضر یک جام آب
چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش — ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

سوال اور گدائی صرف اسی کا نام نہیں کہ مفلس و دولتمند کا طفیلی بن جائے بلکہ دولت جمع کرنے کا ہر طریقہ جس میں انسان خود محنت کر کے نہ کمائے، بلکہ دوسروں کی محنت سے فائدہ اُٹھائے، اقبال کے نزدیک گداگری میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ وہ بادشاہ بھی جو غریبوں کی کمائی پر بسر کرتا ہے، سوال اور دریوزہ گری کا مجرم ہے ؎

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا — ہے ہمارے شہر کا سلطاں گدائے بے نوا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے — کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا
اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید — تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی — دینے والا کون ہے مردِ غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج — کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

گدائی اور فقر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گدائی مالِ دنیا کی احتیاج اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا ہے۔ فقر

لہ اقبال کے نزدیک (قرآنی تعلیم کی رو سے) "سرِ نیاز" (عبودیت) صرف معبودِ حقیقی ہی کے سامنے جھک سکتا ہے۔ اس کے حکم کے علاوہ کسی اور کی اطاعت خودی کے منافی ہے۔ "طلوعِ اسلام"

مادی لذتوں سے بے نیاز ہوکر کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرنا، نوامیس فطرت پر حکمرانی کرنا، دنیا میں امن و انصاف کا ڈنکا بجانا، مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلانا ہے ؂

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل؟ — یک نگاہِ راہ بیں یک زندہ دل
فقرِ خیبر گیر با نانِ شعیر — بستۂ فتراکِ او سلطان و میر
فقر بر کروبیاں شبخوں زند — بر نوامیسِ جہاں شبخوں زند
با سلاطیں درفتد مردِ فقیر — از شکوہِ بوریا لرزد سریر
از جنون مے افگند ہوئے بہ شہر — وا رہاند خلق را از جبر و قہر
بر نیفتد ملتے اندر نبرد — تا درو باقی است یک درویش مرد
آبروئے ما ز استغنائے اوست — سوزِ ما از شوقِ بے پروائے اوست

اِک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اِک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی — ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری — کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا — تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

جب خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا سے مستحکم ہو جاتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں انسان کے قبضے میں آجاتی ہیں۔

از محبت چوں خودی محکم شود — قوتش فرماں دہِ عالم شود

پنجۂ او پنجۂ حق می شود   ماہ از انگشتِ او شق می شود

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گل کوشند   ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

بہ جلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند   بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوش اند

مگر خودی کی غیر محدود قوت تعمیر و تخریب دونوں کا کام کر سکتی ہے۔ خودی سے تعمیر کا کام لینے کے لئے توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی تادیب و تربیت بھی ضروری ہے۔ (بے قید اور بے تربیت خودی کی مثال شیطان ہے جس کے متعلق اقبال کا نظریہ نہایت دلچسپ ہے۔ وہ بھی گوئٹے کی طرح اسے بدی کی قوت نہیں بلکہ خودی اور تخلیق کی عظیم الشان قوت سمجھتے ہیں جو محبت و اطاعت کی راہِ مستقیم سے بھٹک گئی ہے)۔ خودی کی تادیب و تہذیب کا پہلا درجہ اطاعت ہے یعنی اس قانونِ حیات کی پابندی جو خالقِ عالم نے ہر مخلوق کے لئے مقرر کیا ہے ؎

ہر کہ تسخیرِ مہ و پروین کند   خویش را زنجیریِ آئین کند

باد را زندان گل خوشبو کند   قید بو را نافۂ آہو کند

می زند اختر سوئے منزل قدم   پیش آئینے سرِ تسلیم خم

سبزہ بر دین نمو روئیدہ است   پائمال از ترکِ آں گردیدہ است

لالہ پیہم سوختن قانونِ او   رقص پیرا در رگِ او خونِ او

قطرہ ہا دریاست از آئینِ وصل   ذرہ ہا صحراست از آئینِ وصل

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی   تو چرا غافل ازیں ساماں روی

باز اے آزاد دستورِ قدیم   زینتِ پا کن ہماں زنجیرِ سیم

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو   از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو

دوسرا درجہ ضبطِ نفس ہے یعنی انسان اپنے نفس کی ادنیٰ قوتوں کو جن کی سرکشی کی کوئی حد نہیں ہے، قابو میں لائے خصوصاً نفسانی

محبت اور خوف کے جذبات پر جو سب سے زیادہ قوی ہیں غالب آئے ؎

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است		خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمامِ او بہ کف		تا شوی گوہر اگر باشی خزف
طرحِ تعمیرِ تو از گل ریختند		با محبت خوف را آمیختند
خوفِ دنیا خوفِ عقبیٰ خوفِ جاں		خوفِ آلامِ زمین و آسماں
حبِ مال و دولت و حبِ وطن		حبِ خویش و اقربا و حبِ زن
تا عصائے لا الٰہ داری بدست		ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد		فارغ از بندِ زن و اولاد شد

ان دونوں مدارج سے گزرنے کے بعد انسان اس درجے پر فائز ہوگا جسے انسانیت کا اوج کمال سمجھنا چاہیے - یہ نیابتِ الٰہی کا درجہ ہے اور اسے حاصل کرنا ارتقائے خودی کا بلند ترین نصب العین ہے - اسی کی تلاش میں نوعِ انسانی ہزارہا سال سے سرگرمِ سعی ہے اور اسی کے انتظار میں کائنات روزِ ازل سے بے قرار ہے ؎

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است		بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است		ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است
از رموزِ جزو کُل آگہ بود		در جہاں قائم بامر اللہ بود

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا		اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو		در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی		کاروانِ زندگی را منزلی
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر		از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں — ورنہ یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ — حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

ہم نے اوپر اس مافوق انسانی قانون کا ذکر کیا ہے جس کی پابندی خودی کی تکمیل کے لئے لازمی ہے۔ یہ فرد اور ملت کے ربط کا قانون ہے جسے اقبال "بے خودی" کہتے ہیں۔

ایران اور ہندوستان کے شعرا نفسِ انسانی کو قطرے سے اور ذاتِ ایزدی کو دریا سے تشبیہ دیتے آئے ہیں۔ اقبال قطرہ و دریا کی تمثیل سے فرد و ملت کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان کے نزدیک قطرے کے دریا میں مل جانے سے اس کی ہستی فنا نہیں ہو جاتی بلکہ اور استحکام حاصل کر لیتی ہے۔ وہ بلند اور دائمی مقاصد سے آشنا ہو جاتا ہے، اس کی قوتیں منظم اور منضبط ہو جاتی ہیں اور اس کی خودی پائدار اور لازوال بن جاتی ہے ۔

فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
فرد تنہا از مقاصد غافل است — قوتش آشفتگی را مائل است
قوم با ضبط آشنا گرداندش — نرم رو مثلِ صبا گرداندش
چوں اسیرِ حلقۂ آئیں شود — آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اب تک ہم نے اقبال کے کلام سے تصورِ خودی کے وہ عناصر منتخب کر کے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں جو عالمگیر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کا سارا فلسفہ اسلامیت کی روح سے لبریز ہے اور ان کے صحیح مخاطب مسلمان ہیں لیکن ایک سچے شاعر[۵۱] کی طرح ان کے دل میں سارے جہان کا درد ہے، ان کی محبت کل نوعِ بشر کو محیط ہے۔ اور ان کا پیام ایک حد تک سب انسانوں کے لئے عام ہے۔ وہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو اپنی خودی کی تربیت اور اپنی مخصوص ملی روایات کی حفاظت کی تعلیم دیتے ہیں۔ تاکہ وہ زندگی کے صحیح نصب العین سے قریب تر ہو جائیں ؎

من نگویم از بتاں بیزار شو　　کافرے شائستۂ زنار شو

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن　　پشت پا بر مسلکِ آبا مزن

گر زِ جمعیت حیاتِ ملت است　　کفر ہم سرمایۂ جمعیت است

تو کہ ہم در کافری کامل نۂ　　لائقِ طوفِ حریمِ دل نۂ

ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور　　تو ز آذر من ز ابراہیم دور

قیسِ ما سودائیِ محمل نہ شد　　در جنونِ عاشقی کامل نہ شد

---

[۵۲] ان کے کلام سے بے شمار اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں انہوں نے بلا امتیازِ مذہب و ملت کل نوعِ انسانی سے خطاب کیا ہے۔ لیکن ہمارے اس دعوے کا کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا جاں بخش پیام صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے کل انسانوں کے لئے ہے "قطعی ثبوت" "پیامِ مشرق" کے دیباچے سے ملتا ہے، جس کے چند جملے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:-

"حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم اس وقت اس وجہ سے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی اضطراب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک

---

[۵۱] شاعر نہیں بلکہ سچے مسلمان کی طرح۔ اقبال ملت کی تخصیص اس لئے کرتا ہے کہ اس ملت کی خودی کی تکمیل سے عالم انسانیت جادۂ عدل پر گامزن ہوگا جس کا فطری نتیجہ فلاح و سعادت ہے۔ "طلوعِ اسلام"

[۵۲] جب کل نوعِ انسانی کو اس تکمیل خودی کی دعوت دی جائے جس کی طرف قرآن کریم ہدایت کرتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ قرآنی ضابطۂ حیات کی تنفیذ ہوگا۔ "طلوعِ اسلام"

قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے .... مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی پہلو پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی کلام میں اسی صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابلِ احترام ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ اقبال کا نصب العین افراد اور اقوام کی نگاہ کو "جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید و تولید" ہے۔ اسی کو انہوں نے اپنی تصانیف میں مدِ نظر رکھا ہے اور اسی کا پیام مغرب و مشرق کو دینا چاہتے ہیں۔

نظامِ جدید

(NEW ORDER)

نوشتہ فروری ۱۹۳۶ء — پرویز

تاریخِ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ ہر دور اور ہر ملک میں آپ کو کچھ لوگ تو ایسے ملیں گے جو سلسلہ ارتقاء ذہنی کی اولین کڑی تھے جنھیں نہ کچھ اپنے متعلق خبر تھی نہ اپنے ماحول کی وہ ارتباطِ جسم و جان کے لئے بہ تقاضائے طبعی اپنی ضروریات کو پورا کر لیتے تھے اور بس۔ لیکن کچھ قومیں ایسی بھی نظر آئیں گی جو مادی ترقیوں میں اپنے ہم عصروں سے پیش پیش تھیں جنھوں نے مادی اسباب سے فائدہ اٹھانے کی تدابیر سوچیں، سنگین قلعے بنائے، مستحکم عمارات تعمیر کیں، سمندروں کے سینے چیر کر ان پر کشتیاں چلائیں۔ نئے نئے آلات اور قسم قسم کے اسلحہ جات تیار کئے۔ تہذیب و عمرانیت میں یہ لوگ اپنے ہمعصروں سے بہت بلند تھے۔ بابل و نینوا کے کھنڈر، مصر کے آثارِ قدیمہ، ٹکسلا کا زمین دوز شہر، چین کے عجائبات انہی اقوام کی عظمتِ گذشتہ کی زندہ شہادتیں ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں جس سے دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں ان کا کیا انجام ہوا۔ وہ ان سے قوت میں بڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے زمین کو کھود رکھا تھا اور اس کو ایسا آباد کر رکھا تھا کہ انہوں نے بھی نہیں کیا.......... ۳۰/۹

لیکن جہاں ہم تاریخ کے اوراق پر تہذیب و تمدن کے ایسے ایسے آثار دیکھتے ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ ہمیں ایک اور عجیب و غریب سلسلہ بھی نظر آتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جو قوم دولت و حشمت کی مالک تھی اس کے انتہائی عروج میں خدا کا ایک بندہ پیدا ہوتا ہے۔ جو ان کی ان بڑھتی ہوئی قوتوں کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ انہیں خدا کے اٹل قانون سے ڈراتا ہے۔ اس کی سنتِ قدیمہ کی طرف اُن کی توجہ دلاتا ہے ان کے خیالات ان کی ذہنیت اور ان کے قلوب و نفوس میں ایک اور ہی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن وہ لوگ اس کی باتوں پر تمسخر و استہزا کرتے۔ اس سے اعراض و روگردانی برتتے اور اپنی قوتوں کے ہجوم اور طاقتوں کے نشے

ہیں اس کی پکار پر کان نہیں دھرتے -

وَکَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِیٍّ فِی الْاَوَّلِیْنَ وَمَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ

فَاَهْلَکْنَا اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰی مَثَلُ الْاَوَّلِیْنَ ۴۳-۸

اور ہم پہلے لوگوں میں بھی رسول بھیجتے رہے ہیں اور ان لوگوں کے پاس جب کبھی کوئی رسول آیا انہوں نے اس کے ساتھ استہزا کیا پھر ہم نے ان لوگوں کو جو ان سے بھی زیادہ قوی تھے - ہلاک کر ڈالا اور پہلے لوگوں کی یہ حالت (ہلاکت) گزر چکی ہے -

کل انہوں کا تمدن اپنے اوج کمال پر ہے کہ انہی میں سے ایک بت تراش گھرانے سے دعوت توحید کی آواز اٹھتی ہے اور جب وہ قوم اپنی سطوت و قوت کے بھروسے پر اس آواز کو دبانا چاہتی ہے تو **ان کا تختہ الٹ** دیا جاتا ہے - فراعنۂ **مصر** کا آفتاب عروج و اقبال مہر نیمروز کی طرح درخشندہ و تابناک ہے کہ **انہی کی غلام قوم** سے ایک چرواہا اٹھتا ہے اور ان کی تمام شوکت و عظمت کو پانی میں بہا دیتا ہے - عاد و ثمود کی قومیں تہذیب و تمدن کی زندہ یادگار تھیں - اقوام لوط اور سبا کی مادی ترقیاں بھی کچھ کم نہ تھیں لیکن جناب **شعیبؑ و صالحؑ و لوطؑ** انہی کے بھائی بند آتے ہیں اور ان کی بڑھتی ہوئی قوتوں اور ابھرتی ہوئی ترقیوں کو خاک میں ملا دیتے ہیں - یہ تو پھر پارینہ داستانیں سمجھی جائیں گی - ابھی کل کا واقعہ ہے کہ ایرانیوں کا تمدن ایک دنیا کے لئے ضرب المثل تھا رومیوں کی عظمت و ہیبت ایک عالم میں غلغلہ انداز تھی لیکن عربوں کی سی اونٹ چرانے والی بادیہ نشین قوم میں، ایک امی معلم حقیقت ﷺ کی بعثت ہوتی ہے اور چند سال کے عرصہ میں ایران اور روم کا تمدن یوں مٹ جاتا ہے - کانہم لم یکن شیئاً مذکوراً آج دیکھئے اقوام مغرب نے جس قدر مادی ترقی کی ہے اس کی نظیر چشم فلک نے کم ہی دیکھی ہوگی - زمین کی انتہائی وسعتوں پر پہاڑوں کی آخری بلندیوں پر سمندر کی گہرائیوں میں فضائے بسیط کی پہنائیوں میں جہاں دیکھو انسان کا غلبہ نظر آتا ہے - فطرت کی ہر شے ان کی غلام اور کائنات کا ایک ایک ذرہ ان کا تابع فرمان دکھائی دیتا ہے - زمین کی مخفی قوتیں ان کے زیر تسخیر ہیں - آسمان کی آزاد بجلیاں ان کے حکم سے پابہ زنجیر ہیں - یہ تہذیب اور یہ تمدن، یہ فرازیاں اور سربلندیاں انسان نہیں، انسانیت کے لئے باعث صد افتخار اور وجہ ہزار مباہات ہونی چاہئیں لیکن وہی آواز جو بابل و مصر سے اٹھی تھی یہی پکار جو مدائن و سبا سے سکانوں میں آئی تھی جس کی گونج بیت المقدس کی پہاڑیوں سے ٹکرائی تھی اور جس کے حسین و دلکش نغمے بطحا کی وادیوں میں ہر فرد و بشر گوش سنتے تھے - اسی آواز کی صدائے بازگشت ہے جو آج بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہے

کہ یاد رکھو۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا۔ (اقبالؒ)

جو شخص تاریخ کے ان واقعات کا سطحی نگاہ سے مطالعہ کرتا ہے وہ فوراً اسی نتیجہ پر پہونچے گا۔ کہ تہذیب و تمدن کے خلاف جس قدر یہ آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں۔ ان کا مطمح نگاہ یہی ہے کہ انسان کو اس دنیا میں مادی ترقیوں سے روکا جائے اور اسے پھر سے اسی سطح پر لیجایا جائے جہاں یہ اپنے عہد طفولیت میں تھا لیکن مبصر نگاہوں سے یہ حقیقت مستور نہیں کہ واقعہ اس کے خلاف ہے یہ پیغام سرمدی انسان کو مادی ترقیوں کی جن بلندیوں پر لیجانا چاہتا ہے ابھی تک ذہن انسانی نے بایں ہمہ ترقی و تمدن، ان کا خواب بھی نہیں دیکھا۔ اس کا اعلان ہے۔

وسخر لکم الیل والنہار۔ والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ

ان فی ذالک لآیت لقوم یعقلون ۱۶/۱۲

اور تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ رات اور دن سورج چاند اور تارے سب مسخر ہیں اس کے حکم کے ساتھ تحقیق اس میں سمجھنے والی قوم کے لئے نشانیاں ہیں۔

اس سے بھی جامع الفاظ میں فرمایا کہ

وسخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض جمیعاً

اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب تمہارے زیر تسخیر کر دیا

انسان اس دنیا میں انفرادی زندگی بسر کرنے کو نہیں آیا۔ اس کی انفرادی زندگی اجتماعی تشکیل حیات کی ایک اہم کڑی ہے۔ اور انہی کڑیوں کا ربط و ضبط کائنات کی لامتناہی زنجیر بنجاتا ہے۔ ہر انسان کا عمل اس نظام اجتماعیت پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہی وہ کہربائی قوت ہے کہ اگر ایک کڑی کا کوئی حصہ اس سے متمسک ہو جائے تو وہ تمام زنجیر میں یکساں سرایت کر جائے۔ لہذا انسان کے وہ تمام اعمال جن کو وہ اپنی ترقی کا آئینہ دار سمجھتا ہے ایسے حدود فراموش ہونے چاہئیں کہ ایک انسان کی ترقی تمام انسانوں کی ترقی اور ایک کا تنزل تمام کا تنزل کہلا سکے۔ ایک کی خوش بختی سب کی خوش بختی اور ایک کی زبوں حالی سب کی زبوں حالی کے مترادف ہو لیکن اگر خوش بختی اور ترقی کسی ایک فرد۔ ایک خاندان۔ ایک قبیلہ یا ایک قوم میں محدود ہو کر رہ جائے تو یہ چند انسانوں کی ترقی تو ضرور ہوگی۔ انسانیت کی ترقی نہیں ہوگی۔ اب دیکھئے کہ جب تہذیب و تمدن اور جس ترقی و ترفع کے خلاف یہ آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں۔ ان تہاذیب میں انسانیت کا کیا حال تھا۔

حضرت موسیٰؑ سے ارشاد ہوتا ہے۔

اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۲۰/۲۴

فرعون کے پاس جاؤ کہ اس نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

"فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرادی کہ اے میری قوم کیا مصر کی سلطنت میری نہیں ہے۔ کیا یہ نہریں میرے ہی نیچے نہیں چلتیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو میں افضل ہوں اس ذلیل شخص سے جو صاف بول بھی نہیں سکتا۔ اس کو سونے کے کنگن کیوں نہیں پہنائے گئے۔ یا فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھ کر آئے ہوتے" ۴۳/۵۱-۵۳

انہی الزامات میں یہ بھی تھا کہ

"فرعون زمین میں بہت متکبر ہو گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کا زور گھٹاتا رہتا ان کے لڑکوں کو ذبح کراتا اور لڑکیوں کو زندہ رکھتا وہ واقعی بڑا مفسد تھا" ۲۸/۴

عاد و ثمود اور لوط کی قومیں بھی ایسی سرکش و متمرد تھیں۔ حضرت شعیبؑ کی قوم کا یہ عالم تھا کہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں پر بھی اپنی قوت و سطوت کے زور سے قبضہ جما رکھا تھا اور جس چیز کو خدا مفت دیتا ہے۔ کمزور انسانوں کو اجازت نہ تھی کہ ان سے متمتع ہو سکیں قرآن کریم نے صرف ایک واقعہ میں اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے۔

اور جب وہ (حضرت موسیٰؑ) مدین کے کنوئیں (چشمے) پر پہنچے تو اس پر مختلف لوگوں کا مجمع دیکھا جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے ان سے الگ ایک طرف کو دو عورتوں کو دیکھا جو (اپنی بکریاں) روکے کھڑی تھیں ان سے موسیٰؑ نے) پوچھا کہ تمہاری کیا غرض ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتے جب تک کہ یہ چرواہے اپنے جانوروں کو پھرا کر نہ لیجائیں (اس لئے) کہ ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں" ۲۸/۲۳

اسی طرح سورۂ ہود میں ہے کہ وہ غریبوں سے محنت و مزدوری کراتے لیکن ان کا معاوضہ پورا نہ دیتے ناپ تول میں کمی کرتے اور زمین میں فساد مچاتے (۱۱/۸۹) چنانچہ جب اس سرکشی، اس نخوت و تکبر، اس جور و استبداد کی حد ہو چکی تو خدا کے غیر جانبدار قانونِ مکافات نے ان اقوام کی تہذیب و تمدن کو بھی غارت

کردیا کہ انسانیت اس تہذیب کے ہاتھوں ذبح ہو رہی تھی تفصیل کے لئے سورۂ قمر کا ابتدائی حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

رومیوں کی تہذیب نے نوع انسانی کے ساتھ جس درندگی اور بربریت کا سلوک روا رکھا تھا تاریخ کا ایک ایک صفحہ اس سے داغدار ہے۔ معاشرتی دنیا میں یہ حالت تھی کہ رومتہ الکبریٰ کے بازاروں میں انسانوں کے بچے حیوانوں کی طرح فروخت ہوتے تھے۔ مذہبی نظام میں یہ کیفیت تھی کہ یہود تو خیر پھر بھی غیر مذہب کے تھے۔ خود عیسائیوں میں سے جو کسی دوسرے فرقے سے متعلق ہوتے ہرقل کا اعلان تھا کہ اس کے کان، ناک کاٹ دئے جائیں۔ گھر بار جلا دیا جائے۔ سیاسی معاملات میں یونانی مقنن اعظم سولن کا یہ مقولہ نافذ العمل تھا کہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو پھانس لیتا ہے اور قوی کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔

انسانی ترقی کے اس انداز کی بھی جب حد ہو چکی تو آگے والا انقلاب آیا۔ اور ضعیف و ناتواں انسانوں کو ان کی تہذیب کا مالک بنا دیا۔

واورثکم ارضھم ودیارھم واموالھم وارضا لم تطئوھا۔ وکان اللہ علی کل شیء قدیرا۔ ۳۳/۲۷

اور ان کے ملک۔ ان کے گھروں اور ان کے اموال کا تم کو مالک بنا دیا اور اس زمین کا بھی کہ جس پر تم نے ابھی قدم بھی نہیں رکھا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اب تہذیب حاضرہ کو لیجئے۔ مغرب بہ ہیئت مجموعی ترقی یافتہ ہے۔ روئے زمین کے دوسرے انسانوں پر اس کا کیا اثر ہے۔ اس کو چھوڑیئے۔ خود یورپ کے مختلف ممالک اور اقوام کے ایک دوسرے سے کیسے تعلقات ہیں اس کا اندازہ وہاں کی سیاسی فضا سے لگائیے کسی قوم کو دوسری قوم پر بھروسہ نہیں۔ کسی انسان کو دوسرے انسان پر اعتماد نہیں عائلی زندگی میں میاں بیوی۔ باپ بیٹا۔ بہن بھائی ایک دوسرے کی گھات میں لگے رہتے ہیں قومی زندگی میں ایک پارٹی دوسری پارٹی کو کچل دینے کی فکر میں رہتی ہے ملکی زندگی میں ایک ملک دوسرے ملک کو نگل لینے کی تدابیر سوچتا ہے غرضیکہ آج وہاں۔

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے (اقبالؒ)

اس میں شبہ نہیں کہ سائنس کے انکشافات اور مظاہر فطرت کے متعلق تجارب و مشاہدات صفحہ تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے لیکن جس دور اضطراب و التہاب میں یورپ آج گذر رہا ہے اس کی مثال بھی تاریخ عالم میں ملنی مشکل ہے۔ عدم اطمینان و فقدان سکون کی ایک آگ ہے جو مثل۔

نار اللّٰہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ

اللہ کی جلائی ہوئی آگ (کے) ہے جو دلوں پر چڑھ جاتی ہے۔

تمام مفکرین و مدبرین آئے دن سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں۔ کہ اس ہلاکت و بربادی سے بچنے کی کوئی راہ مل جائے مگر

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

امن کی کانفرنسیں۔ تخفیفِ اسلحہ کی مؤتمرین جمعیت اقوام کے اجلاس آئے دن منعقد ہوتے ہیں لیکن سوائے اس کے کہ۔ نشستند و گفتند و برخاستند

نتیجہ کچھ برآمد نہیں ہوتا۔ اور یہ سب اس لئے کہ ایک دوسرے پر اعتماد اٹھ چکا ہے۔ صلح کی گفت و شنید بھی ہوتی رہتی ہے لیکن دوسری طرف جنگ کی تیاریاں بھی بدستور جاری رہتی ہیں تخفیف اسلحہ کی کانفرنس کے لئے نمائندہ بھی بھیجا جاتا ہے۔ اور ادھر اسلحہ ساز کارخانوں کو بھی ہدایات نافذ ہوتی رہتی ہیں کہ دیکھنا کہیں اپنے آتشدانوں کو ٹھنڈا نہ ہونے دینا۔

اس بحران اور بوکھلاہٹ کی بناء پر پانچ دس سال ادھر یورپ میں کئی ایک تحریکیں پیدا ہوئیں اور ناکام تجربات کے ہاتھوں شکست کھا کر بیٹھ گئیں۔ یورپ شخصیت سے جمہوریت کی طرف آیا اور اب جمہوریت سے اکتا کر ڈکٹیٹر شپ کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن ڈکٹیٹر شپ میں بھی انسانیت جس امن و سلامتی میں پہنچ رہی ہے اس کی تصدیق آئے دن کے واقعات کر رہے ہیں۔ جرمنی نے ہٹلر کو قائد اعظم مانا۔ اور وہاں یہودیوں کے ساتھ جس قسم کا سلوک کیا گیا۔ دنیا کے سامنے ہے۔ یہودیوں کے خلاف یہ تمام سرگرمیاں سیاسی اختلاف سے زیادہ نسلی امتیاز پر مبنی ہیں اور یہ وہی جنون ہے جو یورپ میں اکثر اوقات اٹھتا رہتا ہے۔ روس میں یہودیوں کے خلاف یہی کچھ ہوتا رہا۔ اب جرمنی میں آرین اور سامی کے تفوق کا سوال درپیش ہوا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نیٹشے کے نظریہ فوق البشر کی ہی توسیع ہے اٹلی میں فسطائیت پیدا ہوئی اور مسولینی کو خدا کے قاہر کی قوتوں کا اوتار مانا گیا۔ ڈاکٹر ایچ فائنر اپنے ایک مضمون میں کہتا ہے کہ اٹلی کے نوجوانوں سے ایک قسم لی جاتی ہے جس کی رو سے وہ اپنے تمام ارادوں اور خواہشات کو ڈکٹیٹر کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ہر ایک اسکول کی دیواروں پر فسطائیت کے دس آئینی اصول کندہ ہوتے ہیں جن میں حسب ذیل قابل غور ہیں۔

(۱) اس تحریک کو ماننے والا کبھی مستقل امن و سکون کا قائل نہیں ہو سکتا۔

(۲) مسولینی کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔

(۳) ڈکٹیٹر کی زندگی ہر شے سے زیادہ قیمتی ہے۔

(اسٹیٹسمین مورخہ ۳ ؍ ۲۷ ؍ ۳۵)

روس میں اس سے بھی بڑھ کر ایک اور جنون پیدا ہوا اور انہوں نے ہر ایک نیابت پر نفی کا تیر چلانا شروع کر دیا۔ ہر چند اشتراکیت اور فسطائیت توام تحریکیں سمجھی جاتی ہیں لیکن ان میں بھی آپس میں بہت چل رہی ہے۔ اشتراکیین کہتے ہیں کہ فسطائیت سے مفہوم یہ ہے کہ جبر و اکراہ سے ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت کی مدافعت کی جائے اور فسطائی کہتے ہیں کہ اشتراکیت ایک بین الاقوامی سازش ہے جو تہذیب اور مذہب کے استہلاک کے لئے عمل لائی گئی ہے۔ (ملاحظہ ہو اسٹیٹسمین مورخہ ۳ ؍ ۲۶ ؍ ۳۵)

امریکہ کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہاں اطمینان و سکون کی زندگی بسر ہو رہی ہے وہاں کا نظم و نسق نظام حکومت۔ نظام معاشرت ایک ارضی جنت کا نقشہ پیش کرتا ہے لیکن اگلے دنوں اخبارات میں مسٹر ہوور سابق صدر کا ایک مکتوب مفتوح مسٹر روزولٹ موجودہ صدر کے خلاف شائع ہوا جس میں لکھا تھا کہ۔

> اس نظام حکومت سے تو انسانی آزادی و حریت کی بنیادیں گرائی جا رہی ہیں۔ حکومت کو واشنگٹن کے ایک دفتری نظام کے ماتحت مرکوز کر دیا گیا ہے۔ اور ایک وسیع ترین پیمانہ پر شخصی ملکیت و اقتدار کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ جماعتی تفریق کے جذبات عام ہو رہے ہیں اور لوگوں کو ان جرائم کی پاداش میں سزائیں دی جا رہی ہیں۔ جو امریکہ کے تخیل حریت میں کبھی سما ہی نہیں سکتے۔ گورنمنٹ نے بڑے بڑے استوار عہود کو بے باکانہ توڑ دیا گیا ہے اور ملک ایسے قرضہ کی گرفت میں پھنس چکا ہے جو اس سے قبل کبھی دیکھنے سننے میں نہ آیا تھا۔

(اسٹیٹسمین بابت ۲۷ مارچ ۱۹۳۵ء)

یہ تو تھا نظام حکومت۔ نظام امنیت کی یہ حالت ہے کہ وہاں سال گزشتہ ۱۱ ہزار واقعات قتل ہوئے گویا ایک لاکھ کی آبادی میں ۹٫۲ واقعات قتل حالانکہ ۱۹۰۲ء میں ایک لاکھ کی آبادی میں اوسط قتل ۱٫۲ تھا۔

(اسٹیٹسمین ۷ جون ۱۹۳۵ء)

یورپ کی یہی فضا ہے جس سے متاثر ہو کر وہاں کے بڑے بڑے مفکرین نے خود اپنی تہذیب کی تنقید و تنقیص شروع کر دی ہے۔ چنانچہ گذشتہ موسم بہار میں جب انگلستان اور روس کے درمیان باہمی مفاہمت کے مذاکرات ہو رہے تھے جریدہ اسٹیٹسمین نے اپنی ۱۴ اپریل ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا جو

دلچسپ تھا۔ اس کے دوران میں وہ لکھتا ہے۔

تماشا ہے کہ گذشتہ پندرہ سال میں یورپ کے سیاسی مدبرین جہاں کہیں بھی مل بیٹھتے ہیں۔ خواہ وہ کسی قوم سے متعلق ہوں۔ اور ان کی امیدیں۔ آرزوئیں اور ارادے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہر مصالحت، مفاہمت کی گفت و شنید کے مواقع پر بلا استثناء اس قسم کے الفاظ سننے میں آئیں گے کہ ہم فلاں فلاں اقوام یورپ کے نمائندے بے حد مطمئن و مسرور ہیں کہ صاف صاف اور واضح الفاظ میں باہمی مبادلہ خیالات کی بنا پر اب ہماری حکومتوں کے درمیان بین الاقوامی مسائل سے متعلق کسی شعبہ میں بھی کوئی باہمی تخالفِ مفاد باقی نہیں رہا۔ اور اب باہمی امن وامان کے معاہدوں کی بنیادیں بحد استوار ہو گئی ہیں۔ ہمیں کامل اعتماد ہے کہ اب آئندہ ہماری حکومتیں باہمی وفاق و وفا شعاری سے کام لیں گی۔ یا یہ کہ مسٹر فلاں اور فلاں اپنے اس خیال میں پختہ یقین رکھتے ہیں کہ امن عامہ کے استحکام کی ضمانت کے لئے فلاں فلاں ممالک کے مابین رشتہ اخوت و اتحاد کا قائم ہونا نہایت ضروری ہے۔

آگے چل کر اخبار مذکور لکھتا ہے۔

گذشتہ دو ہفتہ میں پیرس میں اس اصول کا اعلان ہوا۔ برلن میں اس کی تائید ہوئی اور ماسکو سے اس کی صدائے بازگشت آئی اور اس میں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں کہ مختلف ممالک اور جمعیت الاقوام سے بھی اس کی تائید میں آوازیں اٹھیں گی۔ لیکن اگر اس زرین اصول میں جسے جنگ عظیم کے بعد سے اس وقت تک مختلف ممالک کے سیاست داں برابر دہراتے چلے آ رہے ہیں۔ کچھ بھی حقیقت ہوتی۔ اگر یہ سیاست داں جو کچھ منہ سے کہتے ہیں اس پر اپنے دل میں بھی یقین رکھتے تو آج یورپ میں یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ صورت حالات ۱۹۱۴ء سے نازک ہے یا بہتر اور نہ کوئی ملک ہمسایہ ملک کی تاخت و تاراج کے لئے اس قدر اسلحہ اندوزی میں منہمک ہوتا اگر یہ سیاسی مدبر اور وہ لوگ جن کے یہ نمائندے ہیں اپنے ان اقوال پر کچھ بھی عمل پیرا ہوتے تو اس دنیا پر آج آسمانی حکومت کا سکہ رواں ہوتا۔ لیکن چونکہ عملاً صورت حالات اس سے کہیں مختلف ہے جو زبانی دعاوی میں پیش کی جاتی ہے۔ اس لئے آج تک کوئی بین الاقوامی مسئلہ مفاہمت سے حل نہیں ہوا۔"

یہ انکار کسی مزید تبصرہ کے محتاج نہیں۔ فی الحقیقت یورپ کی تمام تہذیب کی روح اور اس کی موجودہ ذہنیت ان الفاظ کے اندر پوشیدہ ہے قرآن کریم نے منافقین کے متعلق فرمایا ہے۔

تحسبھم جمیعًا وقلوبھم شتّٰی ۵۹/۱۴ بظاہر وہ اکٹھے معلوم ہونگے لیکن ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہونگے

سو بعینہٖ یہی حالت آج یورپ کے سیاسی مدبرین کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب ان کا ایک دوسرے سے یہ رویہ ہے تو تا بدیگراں چہ رسد مصر کی تہذیب میں اگر ایک ہی شہر میں پیدا ہونے والے دو بچے پیدائشی اعتبار سے دو مستقل حیثیتیں رکھتے تھے جو تمام عمر ان کے ساتھ وابستہ رہتی تھیں۔ تو آج حالات اس سے بہتر نہیں ہیں۔ علاوہ نسلی امتیاز کے، آج جغرافیائی حدود اس درجہ سخت گیر واقع ہوئی ہیں کہ ایک ہی زمین کے ایک انچ دائیں اور بائیں پیدا ہونے والے بچوں کے حقوق میں پیدائشی امتیاز ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ گھر جنہیں خدا کی عبادت کے لئے مخصوص کیا جاتا ہے اس میں بھی رنگ اور نسل اور زمین کا امتیاز باقی رکھا جاتا ہے عہد جہالت کے ایسے واقعات کو ہم وحشت و بربریت سے موسوم کرتے ہیں اس لئے کہ ان کی تاریخ ہم نے لکھی ہے لیکن جب اس دورِ تہذیب کی تاریخ آنے والی نسلیں لکھیں گی تو خدا معلوم کن کن ناموں سے ان کو یاد کریں گی۔ یہ غلط ہے کہ پہلی قومیں وحشی و جاہل تھیں اس لئے وہ فنا ہو گئیں قرآن کریم شاہد ہے کہ:۔

> ہم نے ان لوگوں کو ایسی قوت و سطوت دی تھی کہ تمہیں بھی ایسی قوت نہیں دی اور ہم نے ان کو آنکھ، کان اور دل دئے تھے۔ لیکن چونکہ وہ قانون خداوندی سے انکار کیا کرتے تھے اس لئے ان کے کان اور آنکھیں اور دل ان کے کچھ کام نہ آئے اور جس بات کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے اس نے ان کو آن گھیرا" ۴۶/۲۶

دوسری جگہ عاد و ثمود کے متعلق ہے۔

وکانوا مستبصرین ۔ ۲۹/۳۸ وہ چشم بصیرت رکھتے تھے۔

آج بھی یہی حالت ہے۔ تدبر و تفکر، تجسس و تفہیم، عقل و شعور، علم و تمیز، سب کچھ موجود ہے لیکن چونکہ ذہنیت مختلف ہے۔ اس لئے یہ تمام ترقیاں یہ تمام علوم و فنون کی کارفرمائیاں بجائے نوع انسانی میں امن و سلامتی پیدا کرنے کے استہلاک و تخریب کے ہولناک سامان فراہم کر رہی ہیں۔ آج سب سے بڑے سائنسدان سب سے بڑے فلسفی۔ سب سے بڑے حکیم کا دماغ اس تگ و دو میں منہمک ہے کہ ایک آنے والی مزعومہ جنگ کے لئے وہ ایسے ایسے ہلاکت آفرین آلات ایجاد کرے۔ ایسے ایسے تخریبی نظریئے

وضع کرے ایسی ایسی خطرناک اسکیمیں تیار کرے کہ حریف مقابل ایک آن میں فنا ہو جائے اور یہی وہ ذہنیت ہے جو انھیں رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر ہلاکت و تباہی کے مہیب غاروں کی طرف لئے جا رہی ہے۔

سنستدرجهم من حيث لا يعلمون ﴿۴۴/۲۶﴾ ہم ان کو بتدریج اس طرح لئے جا رہے ہیں کہ ان راہوں کی انہیں خبر بھی نہیں ہوتی۔

یہ خدا کا ناقابل تغیر قانون ہے جو آج بھی اسی طرح قائم العمل ہے جس طرح آج سے پانچ ہزار سال پیشتر تھا۔

"ہم نے ہر ایک کو ان کے اعمال کے بدلے پکڑ لیا۔ سو ان میں سے بعض پر تو تند ہوا چلا دی۔ اور بعضوں کو ہولناک آواز نے آن دبایا۔ بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا۔ اور بعض کو غرق کر دیا اور اللہ نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا۔" ﴿۴۰/۲۹﴾

ہندوستان کی تہذیب کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ پیدائشی امتیاز کی جن صورتوں کو دوسری جگہ معاشرتی آئین نے جائز قرار دے رکھا تھا۔ یہاں مذہب کی بارگاہ عالیہ سے ان کے ناقابل تغیر ہونے کا لائسنس مل رہا ہے اور یہ انسانی غلامی کی ایسی لپٹر زنجیریں ہیں کہ جن کو گلے میں پہننے سے پہلے ان کے سامنے انسان ڈنڈوت بھی بجا لاتا ہے۔ برہمن کی خدائی کو دنیا کی کوئی قوت توڑ نہیں سکتی، کہ دیوتاؤں کی شکتی اور رشی منیوں کی اشیرباد اس کے ساتھ ہے۔ ایک شودر کو جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس زمین پر چل سکے جو برہمنوں کے لئے مخصوص ہے۔ وہ زبان بول سکے جو اونچی ذات والوں کے ہاں مروج ہو۔ یا وہ کھانا کھا سکے جو ان کے ہاں استعمال میں لایا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو کوچین میں اچھوتوں کے مظالم کی رپورٹ بحوالہ اسٹیٹسمین مورخہ ۲۱ جولائی ۱۹۳۵ء) اس تہذیب کے اجارہ داروں کا یہ طرز عمل ان لوگوں کے ساتھ ہے جو ان کے ہم مذہب ہیں۔ ہم ملت ہیں۔ ایک ملک کے رہنے والے ہیں جن میں کوئی جغرافیائی حدود حائل نہیں رنگ اور مذہب کا فرق نہیں جب ان کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے تو ظاہر ہے کہ دوسری زمین کے باشندوں کے ساتھ دیگر مذاہب کے متبعین کے ساتھ دوسرے رنگ، نسل، قوم، ملت کے افراد کے ساتھ ان کی ذہنیت کس قسم کی ہو گی۔ دنیائے کائنات کی عالمگیر انسانیت اس جیسے دوام میں کس طرح آزادی کا سانس لے سکتی ہے۔

لیکن ان سب کے برعکس جب دنیاوی ترقی اس مخصوص ذہنیت کے ماتحت ہوگی جس کا اشارہ پہلے کیا جا چکا ہے تو عام دنیا کا رنگ اس سے کہیں مختلف ہوگا۔ ان کی ترقی سے یہ مفہوم نہیں ہوگا کہ اپنی قوت کے قیام و بقا کے لئے وہ کمزور اور ضعیف انسانوں کا خون چوسنا شروع کر دیں۔ جائز و ناجائز کی تمیز اٹھا دیں اور خدا کی وسیع زمین انسانوں پر تنگ کر دیں۔ بلکہ ان کے متعلق فرمایا کہ۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف

ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور ۲۲/۴۱

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں متمکن کر دیں تو ان کا کام لوگوں کو خدا کے راستے سے ہٹانے کا نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ خدا کی عبادات کو قائم کریں گے کمزوروں کی کمائی سے اپنے تعیش کے سامان فراہم نہیں کریں گے۔ بلکہ اپنی کمائی سے کمزوروں کی امداد کریں گے جو احکام صادر کریں گے ہر ایک کے لئے یکساں اور برحق ہوں گے اور جہاں جہاں برائی دیکھیں گے بلا امتیاز احد سے اس کو روکیں گے۔ اور ان کا اور جن کے سامنے ان کا معاملہ ہوگا۔ ان سب کا انجام کار خدا کے ہاتھ میں ہوگا۔ ان سب کی تہذیب میں تمام پیدائشی امتیازات جو ابدی غلامی کی 'اصل ہیں' نابود ہو جائیں گے۔ پیدائش کے اعتبار سے ہر انسان برابر ہوگا اور عزت و تکریم کا معیار دنیاوی وجاہت اور قوت وحشمت نہیں ہوگی۔ بلکہ سب سے زیادہ واجب الاحترام وہ ہوگا۔ جو سب سے زیادہ خدا ترس ہوگا۔ خواہ وہ ایک ادنیٰ غلام زادہ ہی کیوں نہ ہو۔

یا ایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ وجعلنٰکم شعوبا و قبائل لتعارفوا

ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم ۴۹ : ۱۳

لوگو ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا اور یہ قبیلے اور خاندان تو ایک دوسرے کی شناخت کا ذریعہ بنائے گئے ہیں۔ درحقیقت خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

نسبی امتیازات کے ساتھ ہی جغرافیائی حدود کے امتیازات بھی اٹھ جائیں گے ہر شخص کو خدا کی وسیع کائنات میں معیار تقویٰ کے مطابق یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور دونوں کبھی نہیں مل سکیں گے"۔ یہ عہد جاہلیت کی باتیں قرار دی جائیں گی کہ اس تہذیب کا اصول ہے کہ

للہ المشرق والمغرب مشرق و مغرب سب اللہ کی جہتیں ہیں ان میں کوئی فرق نہیں

ان کی سطوت میں حاکم و محکوم، ادنیٰ و اعلیٰ امیر و غریب سب انسان عدل و انصاف کی نگاہ میں برابر ہوں گے۔ مذہب۔ وملّت مسلک و مشرب کسی چیز کا امتیاز نہیں ہوگا۔ کہ ان کے سامنے یہ اصول ہوگا کہ

لا یجرمنکم شنآن قوم ان لا تعدلوا ۔ اعدلوا ۔

کسی قوم سے دشمنی تمہیں کہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ اس کے ساتھ عدل و انصاف نہ برتو۔ ہر حال میں عدل کرو۔

ان کی تہذیب میں وحدت انسانی کا تخیل ان بلندیوں پر پہنچا ہوگا کہ کسی ذہن کی وہاں تک رسائی نہیں ہوسکی کہ آئین الٰہی کے مطابق جملہ انسانوں کی تخلیق نفس واحدہ سے ہوتی ہے۔

ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ ۷ : ۱۸۹

وہی ہے جس نے تم (سب) کو نفس واحد سے پیدا کیا۔

وہ دنیا میں جتنی ترقیاں کریں گے ان سے غرض کوئی ذاتی مفاد حاصل کرنا نہیں ہوگا، بلکہ انسانیت عظمیٰ کا عام مفاد خالصتہً للّٰہ ان کا مقصد زندگی ہوگا کہ ان کا نصب العین ہی یہ قرار دیا گیا ہے۔ کہ

قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للّٰہ رب العلمین ۔

کہدے کہ میری نمازیں، اور میری قربانیاں۔ میرا جینا اور میرا مرنا محض اللہ کے لئے ہے جو تمام انسانوں کا رب ہے۔

گویا ان کی تہذیب ان اصولوں پر مبنی ہوگی جو ان کے خدا نے ان کے لئے بنائے ہیں اور چونکہ وہ خدا رب العلمین ہے اس لئے اس کے وضع کردہ اصولوں میں کسی انسان کی رو رعایت نہ ہوگی اور یہی وہ تہذیب ہے جس میں وحدت انسانیت پیدا ہوسکتی ہے کہ جس کا نقدان آج اور ہمیشہ سے دنیا میں اضطراب و عدم اطمینان کا باعث رہا ہے وحدت خالق کے ایمان کا خاصہ ہی یہ ہوگا کہ اس سے وحدت مخلوق کا تخیل پیدا ہو اور یہی وہ تہذیب ہے جس کی روح اس حکم میں مضمر ہے جو سب سے پہلے خدا کا نام بلند کرنے والے کو دیا گیا فرمایا۔

یا ایھا المدثر۔ قم فانذر وربک۔ فکبر۔

اے کپڑا اوڑھنے والے اٹھ اور لوگوں کو آگاہ کردے اور اپنے رب کا نام بلند کر۔

مقصد یہ ہے کہ تم خدا کا نام بلند کرتے جاؤ وہ تمہارا نام بلند کرے گا اور اگر وہ تمہارا نام بلند کرے تو

تم بھی اس کا نام بلند کرو۔ غرضیکہ ایک ایسا دائرہ قائم ہو جائے جس کا مرکز خدا ہو اور محیط تمام نوع انسانی اُس آسمانی بادشاہت کے ہر فرد کا مقصد حیات صرف وہ ہوگا جس کی طرف آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی ــــ رَبَّکَ فَکَبِّرْ۔ اعلائے کلمۃ الحق ــ

سطور بالا ۱۹۳۶ء میں سپرد قلم کی گئی تھیں۔ اس کے بعد آج تک یورپ جن واقعات و حوادث کی آماجگاہ بنا رہا اور بن رہا ہے اور انسانیت عملاً جس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہے وہ محتاج تبصرہ نہیں۔ یورپ اپنے نظامِ زندگی کے ان نتائج و عواقب کو دیکھکر کسی جدید نظام کے لئے تڑپ رہا ہے۔ چنانچہ آج ہر طرف سے یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ دنیا کو ایک نئے نظام (NEW ORDER) کی ضرورت ہے۔ لیکن کسی کے ذہن میں نہیں کہ وہ نیا نظام کیا ہو؟ اس لئے کہ پہلے نظامہائے زندگی میں خرابی یہ تھی کہ وہ انسانی دماغوں کے وضع کردہ تھے۔ اب پھر ایک جدید نظام کے لئے انسانی ذہنیں ہی مصروف تجسّس ہیں۔ دنیا آہستہ آہستہ خود اس نتیجہ پر پہنچتی جا رہی ہے کہ انسانی فطرت کے مطابق کوئی اور ہی نظام ہو سکتا ہے۔ اور یہ نظام وہ ہوگا جو انسانوں سے بلند و بالا ہستی کا متعین فرمودہ ہو۔ یہ نظام آج قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ ضرورت کسی جدید نظام کی نہیں بلکہ اس نظام کی ہے جو فطرتِ انسانی کے مطابق ہو۔ اگر فضا زہریلے جراثیم سے بھر چکی ہو تو انسانی زندگی کے لئے ہوا کو چھوڑ کر کسی جدید شے کی تلاش بیکار ہوگی۔ انسانی زندگی کا مدار ہوا پر ہے اور ہوا کا کوئی بدل ہو نہیں سکتا۔ ایسے میں ضرورت کسی جدید نظام تنفس کی نہیں بلکہ مصفا ہوا کی ہے۔ فضا کو جراثیم سے پاک کر دیجئے زندگی خود بخود سنبھل جائے گی۔ اگر کوئی شخص کمرے کے دروازے بند کر کے چاہے کہ روشنی کے علاوہ کسی اور شے سے تاریکی کو دور کر دے تو وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے گا۔ تاریکی کو دُور کرنے کے لئے کسی "جدید انتظام" کی ضرورت نہیں بلکہ اسی پرانے نظام کی طرف لوٹ آنے کی ہے جس سے انحراف کا فطری نتیجہ تاریکی تھا۔ دنیا نے خدائی ضابطۂ حیات سے منہ موڑا تو اس کا فطری نتیجہ ہلاکت آمیز جراثیم اور وحشت خیز تاریکی تھا اب ہوا اور روشنی کے لئے کسی جدید انتظام کی کاوش بیکار ہے۔ ضرورت ہے کہ انسان اس نظام کہنہ کی طرف لوٹ جائے جس سے اعراض و اجتناب کا فطری نتیجہ یہ مصائب و مشکلات تھیں۔ لہذا انسانیت کے امراض حاضرہ کا مداوا کسی جدید نظام میں نہیں بلکہ اس پرانے نظام میں ہے جو ہمیشہ نیا ہے اور کبھی پرانا نہیں ہو سکتا

وہ آج بھی انسانیت کے امراض کا حتمی علاج ایسا ہی ہے جیسا آج سے چودہ سو سال پہلے تھا۔ لیکن مشکل یہ ہے انسان اس طرف توجہ بہت کم کرتا ہے۔ بایں ہمہ۔ چونکہ فطرت انسانی کے مطابق وہی اور صرف وہی۔ نظامِ حیات ہے اس لئے چاروں طرف سے مایوس ہو کر انسان بالآخر اسی کی طرف آئے گا۔ قرآن کریم کے علاوہ انسانیت کو کہیں پناہ مل ہی نہیں سکتی۔ جیسے روشنی کے علاوہ کبھی تاریکی دور ہی نہیں ہو سکتی۔

لیکن آہ! آج دنیا میں کون ہے جو بھولے بھٹکے انسانوں کو قرآن کی طرف دعوت دے؟ یورپ ہمہ تن اضطراب ہے۔ دنیا سراپا انتظار ہے۔ گھبرایا ہوا انسان چشم براہ اور گوش برآواز ہے لیکن

آوازۂ حق آتا ہے کب اور کدھر سے

مسکین و لکم ماندہ دریں کشمکش اندر (اقبالؒ)

اگر آج کوئی ایسا مردِ مومن پیدا ہو جائے جو دنیا (بالخصوص یورپ) کے سامنے قرآن پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو یقین مانئے ساری دنیا (اور سب سے پہلے یورپ) قرآن کے سامنے اپنا سر نیاز جھکا دے۔ دیر صرف پیش کرنے والوں کی طرف سے ہے ماننے والوں کی طرف سے تو اب دیر معلوم نہیں ہوتی اس لئے کہ انہیں تو خود اس کی تلاش ہے اگر اس تمام کشت و خون کے بعد جس سے آج یورپ کے میدان لالہ زار اور تمام زمین لرزہ براندام ہے۔ اور جس کے منظر و تصور سے ہر قلبِ حساس میں ارتعاش پیدا ہو رہا ہے۔ دنیا نے قرآنی نظام کو ضابطۂ حیات قرار دے لیا تو سمجھ لیجئے کہ انسانوں کی یہ قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں کہ "خونِ صد ہزار انجم" کی قیمت میں اگر ایک نئی سحر مل جائے تو یہ سودا خسارہ کا نہیں۔ اے کاش چشمِ فلک کہیں ایسا انقلاب بھی دیکھ لے!

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

فیضانِ اقبالؒ

(از اسد ملتانی)

{کچھ دن ہوئے میں اپنے متفرق مسوّدات کا جائزہ لے رہا تھا خوش قسمتی سے ان میں ایک ایسی تحریر مل گئی جس میں حضرت علامہ اقبالؒ سے ایک ملاقات کا مفصل حال درج تھا۔ اُسے دیکھ کر اس وقت کی یاد تازہ ہوگئی جب مارچ ۱۹۳۳ء میں وہ جامعہ ملیہ میں غازی رؤف پاشا کی ایک تقریر کے موقع پر جلسہ کی صدارت کرنے کے لئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ میں محترمی جناب امداد حسین صاحب اخگر مرادآبادی۔ اور عزیز دوست مولوی محمد احمد ندوی (جو ۱۹۳۶ء میں عین جوانی میں فوت ہو گئے) کے ہمراہ اُن سے ملنے گیا۔ ۹ بجے صبح سے کوئی ۱۲ بجے تک نہایت دلچسپ علمی صحبت قائم رہی۔ اسی روز وہ سر عبداللہ سہروردی مرحوم کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ جب ادھر سے ٹیلیفون پر ٹیلیفون آنے لگا تو بادلِ ناخواستہ یہ مجلس ختم کرنی پڑی ورنہ جس توجہ سے وہ ہم سے گفتگو فرما رہے تھے اس کے پیش نظر ہم ابھی کچھ دیر اور ان کے ارشادات سے فیضیاب ہوتے رہتے۔

میں نے ملاقات کا حال غالباً اسی روز لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن افسوس کہ نامکمل رہ گیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد مسوّدہ ایسے کاغذات کے ساتھ خلط ملط ہو گیا کہ پھر اس کا خیال تک نہ رہا۔

اس ملاقات میں کچھ تو اہم علمی مسائل زیرِ بحث آئے اور کچھ عام باتیں ہوئیں۔ ان میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن کا بعض حضرات نے بھی اپنی ملاقاتوں کے بیان میں ذکر کیا ہے لیکن جی نہیں چاہتا کہ اس کے سبب میں اپنے نامکمل بیان میں بھی قطع و برید کر دوں۔ لہٰذا بے کم و کاست پیش کئے دیتا ہوں

حضرت علامہ سے بعض دوسری ملاقاتوں کے بھی کچھ حالات حافظے میں محفوظ ہیں اگر کبھی توفیق ہوئی تو کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کروں گا۔

}

اسد

۱۴ مارچ ۱۹۳۳ء۔ آج ۹ بجے صبح جناب اخگر مراد آبادی۔ مولانا محمد احمد ندوی اور میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی "دارالسلام" واقع دریا گنج میں ڈاکٹر سر اقبال سے ملنے گئے۔ اخگر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی شان میں ایک انگریزی نظم لکھی تھی جو ایک روز پہلے مولانا شفیع داؤدی کے حوالے کر دی گئی تھی چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ کل شام آپ کی نظم مولانا شفیع داؤدی نے مجھے دی ابھی تک میری جیب میں ہے دیکھ نہیں سکا۔ اخگر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں انگریزی

زبان

ہماری زبان نہیں — ممکن ہے اس میں غلطیاں ہوں مگر اصل مقصد ان جذبات کا اظہار تھا جو آپ کی نسبت میرے دل میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بولے کہ مولانا! زبان کی کچھ پروا نہیں۔ زبان تو اہلِ فکر خود پیدا کرتے ہیں۔ اہلِ زبان کے متعلق تو اتنا سمجھتا ہوں کہ انہیں چلتے چوٹے کے الفاظ کافی تعداد میں معلوم ہوتے ہیں ورنہ علمی خیالات کے اظہار کے لئے اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان دونوں برابر ہیں۔ دونوں کو خیالات کے مطابق الفاظ تراشنے پڑتے ہیں۔ مرزا بیدل کی فارسی کو اہلِ زبان نے کبھی تسلیم نہیں کیا کیونکہ وہ محاورات تک نئے پیدا کر لیتے ہیں مثلاً ان کا ایک مصرع ہے ع

بہ ہر قدمے خرام می کاشت

"خرام کاشتن" فارسی میں کوئی محاورہ نہیں مگر جو خیال بیدل کے ذہن میں تھا اس کو ادا کرنے کے لئے لازمی تھا کہ یہی الفاظ استعمال کئے جاتے کیونکہ ان کے علاوہ اور کوئی الفاظ فارسی زبان میں اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتے افسوس تو یہ ہے کہ جس طرح مذہب میں تقلید سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح ادبیات میں بھی تقلید کی جاتی ہے مانا کہ محاورے میں کسی حد تک اہلِ زبان کی پیروی مناسب ہے مگر لطف تو یہ ہے کہ ترکیب اور استعارے میں بھی اساتذہ کی سند طلب کی جاتی ہے۔ اگر یہ خیال رکھا جائے تو جدت و اختراع کا دروازہ بالکل بند ہو جاتا ہے

وضعِ الفاظ

میں نے کہا کہ بالعموم جدتِ ترکیب و استعارہ پر اعتراض نہیں ہوتا بلکہ اس امر پر کہ ایک غیر اہلِ زبان اظہارِ خیال کے لئے کوئی نیا لفظ یا محاورہ پیدا کرتا ہے حالانکہ اصل زبان میں اس کے لئے پہلے ہی لفظ یا محاورہ موجود ہوتا ہے۔ کہنے لگے ہاں۔ جب زبان میں اچھا لفظ اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے موجود ہو تو نیا لفظ تراشنا غیر ضروری ہے لیکن اگر کوئی ایسا کر بھی دے اور لفظ صوتی لحاظ سے غیر موزوں بھی نہ ہو تو میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ البتہ یہ شرط ہے کہ وہ نیا لفظ کسی ہم جنس زبان کا ہو۔ جیسے اردو میں عربی فارسی۔ پنجابی وغیرہ کا لفظ کھپ سکتا ہے مگر لاطینی وغیرہ کا نہیں۔

اقبال کی فارسی

میں نے کہا۔ آپ نے فرمایا ہے کہ لفظ صوتی لحاظ سے غیر موزوں نہ ہو۔ کیا سماعت کی اس تربیت کے لئے زبان کے بکثرت مطالعہ کی ضرورت نہیں پڑتی؟

فرمایا میں اس صفت کو ایک عطیۂ قدرت سمجھتا ہوں۔ فارسی میں میری رسمی تعلیم صرف میٹرک تک رہی ہے یا اس سے پہلے کچھ مکتبوں میں پڑھی تھی مگر اب جو میں فارسی میں لکھتا ہوں اور کسی محاورے کے متعلق شک گذرتا ہے اور اس وقت کوئی لغت یا اور کتاب پاس نہیں ہوتی تو اپنے کانوں پر بھروسہ کرتا ہوں جو الفاظ کانوں کو بھلے معلوم ہوں وہی رکھ دیتا ہوں اور ہمیشہ دیکھا ہے کہ بعد میں وہی محاورات درست ثابت ہوئے ہیں۔

اس موقع پر انگر صاحب نے دریافت کیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کے فارسی کلام پر کبھی کبھی اہل زبان نے کچھ رائے ظاہر کی ہے۔ بولے کہ اعتراض کرتے ہوں گے لیکن مجھ تک کبھی نہیں پہنچے۔ البتہ بعض اہلِ زبان سے تعریف سننے میں آئی ہے۔

میں نے کہا کہ امیر خسرو پر بھی اہل فارس نے یہی اعتراض کیا ہے کہ وہ فارسی میں ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کر جاتے ہیں۔ مثلاً ع

عالم ہمہ منّت یک طرف و آں شوخ تنہا یک طرف

"منّت" کا لفظ ان معنوں میں نہیں جن میں یہ فارسی زبان میں مستعمل ہے۔ بولے۔ ہاں مگر یہ بات بھی ہے کہ بعض اوقات ایک ہی لفظ ہندوستان اور ایران میں بالکل مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسے لفظ "تنخواہ" سے ہم کیا مراد لیتے ہیں اور وہ کیا۔

اردو میں پنجابی

اسی سلسلے میں فرمایا میرا ہمیشہ ایسا خیال رہا ہے کہ پنجاب میں طلباء کیلئے جو اردو کورس ہوں اُن میں حسب ضرورت پنجابی کے الفاظ استعمال ہونے چاہئیں مثلاً مولانا آزاد نے اپنے قاعدے میں ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ "لیمپ جلاؤ" دلی میں تو یہ لفظ بچے بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں مگر پنجاب میں بچے تو کیا سمجھیں گے استاد بھی اس کے معنے دریافت کرتے ہیں اگر اس کے بجائے کوئی ایسا نام استعمال ہوتا جو اردو کا نہ سہی لیکن پنجاب میں عام ہوتا تو یقیناً زیادہ مفید رہتا۔ اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے پنجاب میں یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ زراعت کی کتابوں میں بالخصوص پنجابی کے الفاظ بے تکلف استعمال کئے جائیں۔

مغرب کی تقلید

میں نے سوال کیا کہ پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ ہمیں مغربی تہذیب کی نقل نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اس سے اسکی فضیلت کا عملی اقرار ہوتا ہے جس کے ہم اصولاً خلاف ہیں۔ ادھر ہم کہتے ہیں کہ مغربی علوم و فنون تہذیب و تمدن کی بنیاد ہم نے رکھی۔ گویا ہم تمدن و ترقی کو ایک خاص مقام پر پہنچا کر ٹھہر گئے۔ اہل مغرب نے وہیں سے لیکر اسے آگے ترقی دی اب چند صدیوں کے بعد ہم جو جاگے تو اہل مغرب کو کہیں سے کہیں پہنچا ہوا پایا۔ کیا اس وقت ہمیں اپنی قوت تخلیق سے کام لیکر اسی مقام سے اپنی ترقی کی منزل شروع کرنی چاہیئے جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا یا وہاں سے جہاں اسے اہل مغرب نے اس وقت پہنچا رکھا ہے؟ کیا مناسب نہ ہوگا کہ پہلے وہ سب کچھ حاصل کرلیں جو اہل مغرب معلوم کر چکے ہیں اور پھر اپنی قوتِ تخلیق کو بروئے کار لاکر آگے ترقی کریں؟ میرا خیال ہے کہ ترک اس وقت اسی چیز پر عمل کر رہے ہیں۔

ترکوں کا رویہ

فرمایا کہ نقل اور اخذ میں بہت فرق ہے۔ ترک نقل کر رہے ہیں نہ کہ اخذ۔ نقل سے قوتِ تخلیق کمزور ہو جاتی ہے مگر اخذ ترقی کے لئے لازمی ہے۔ مغرب نے جو نئی تحقیقات اور ایجادات کی ہیں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ان کو فوراً اخذ کرکے اپنی مزید ترقی کی بنیاد رکھیں۔ ایک یہ امر بھی مدنظر رہے کہ تقلید اور نقالی علوم اور سائنس میں مذموم نہیں بلکہ ضروری ہے لیکن مذہب۔ اخلاق اور تمدن میں یہ زہر کا حکم رکھتی ہے مثلاً ترکوں کو دیکھئے انہوں نے ہیٹ[1] کو علامت ترقی سمجھ لیا ہے حالانکہ اصل چیز جو لازمۂ ترقی ہے وہ ہیٹ کے نیچے ہے۔

میں نے غازی رؤف بے اور ترکوں کے متعلق دریافت کیا تو بولے کہ غازی رؤف بے مصطفےٰ کمال سے اختلاف کے باعث مدت سے فرانس میں رہتے ہیں۔ مصطفےٰ کمال ان کو بارہا ترکی آنے کی دعوت دے چکے ہیں مگر یہ نہیں جاتے ایک تو انہیں اعتماد نہیں۔ دوسرے اپنا وہاں جانا بے سود سمجھتے ہیں کیونکہ ترکی مجلس قومی میں حکومت کی مخالف جماعت کا کوئی وجود نہیں اور کوئی شخص مصطفےٰ کمال کے خیالات کے برخلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔

ترکی کی موجودہ حالت کے متعلق فرمایا کہ میں فوزی پاشا اور منیر بے جیسے بڑے بڑے آدمیوں سے

---

[1] انگریزی ٹوپی

لہٰذا ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ترک مصطفےٰ کمال کی بدعات سے خوش نہیں ہیں۔ بلا مبالغہ تقریباً ۹۰ فیصدی لوگ مصطفےٰ کمال کے مخالف ہیں۔ ایک آدھ دفعہ اس پر قاتلانہ حملے بھی ہو چکے ہیں اور کچھ زیادہ بعید نہیں کہ اسے قتل کر دیا جائے اگر ایسا نہ بھی ہوا۔ تو ترک زیادہ سے زیادہ اس کی زندگی تک اس کے استبداد کو ناچار گوارا کر لیں گے۔ اس سے زیادہ دیر تک ہرگز نہیں۔ ردِ عمل ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ ترک نوجوان اسے سلطان عبدالمجید سے بھی زیادہ مستبد سمجھتے ہیں۔ صرف اس کی خدمات کا خیال اور خانہ جنگی کا اندیشہ ہے جو ترکوں کو کسی جارحانہ اقدام سے باز رکھتا ہے ورنہ ترک ویسے ہی پکے مسلمان ہیں جیسے ان کے آباؤ اجداد تھے۔ اور وہ تفریج کو اچھا نہیں سمجھتے۔ مختصر یہ کہ ترکی کا مستقبل کسی صورت میں بھی مایوس کن نہیں ہے۔

اسلام کا مستقبل

یہاں سے سلسلۂ کلام تہذیب مغربی اور اسلام کے تصادم کی طرف چل پڑا۔ فرمانے لگے کہ یورپ کے سفر کے دوران میں میں نے دیکھا ہے کہ یورپ میں خواص کے علاوہ اب عوام میں بھی اسلام کے متعلق دلچسپی اور تجسس روز بروز بڑھ رہا ہے۔ ادھر مشرق میں مغربی تہذیب کا اثر ترقی پر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامی تہذیبوں میں صلیبی جنگوں نے جو تفریق ڈال دی تھی وہ اب دور ہونے والی ہے اور مشرق و مغرب پھر بغلگیر ہونے والے ہیں۔ میں نے کہا اغلب ہے کہ ایسا ہو جائے مگر کیا معلوم اسلام مغربی تہذیب کو اپنا لے یا مغربی تہذیب اسلام کو جذب کر لے؟

بولے ہاں عقلی طور پر تو دونوں صورتیں ممکن ہیں مگر ہمارے عقیدے اور اسلام کی گذشتہ تاریخ کی رُو سے پہلی صورت ہی کی تائید ہوتی ہے۔ عقیدۃً تو اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کا وعدہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ اسلام ہی غالب آئے گا۔ ساتھ ہی اسلام کی تاریخ صاف صاف بتاتی ہے کہ اسلام کے مقابلے میں مختلف تہذیبیں آئیں مگر اسلام نے مقابلہ کئے بغیر ان کو اپنا کر کے ان پر ایسی مہر ثبت کر دی کہ وہ خود اسلامی تہذیب کا جزو بن گئیں۔ یونان اور ایران کی تہذیبیں دونوں اسلام میں جذب ہو کر گویا "مسلمان" ہو گئیں۔ اسی طرح اغلب یہی ہے کہ مغربی تہذیب بھی اسلام میں جذب ہو کر اسلامی ہو جائے گی۔ قیاس یہی کہتا ہے آگے خدا کو معلوم کیا ہوگا کوئی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی۔

فلسفہ اور مذہب

یہاں پہنچ کر میں نے اپنی نظم "سوال بہ اقبال"[۱] یاد دلائی اور کہا کہ میں نے آپ کے ارشاد

---

[۱] میں نے چند اشعار میں فلسفۂ خودی کے بعض متضاد پہلوؤں کے متعلق حضرت علامہ سے سوال کئے تھے۔ یہ اشعار رسالہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ فروری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئے تھے۔

کے مطابق آپ کے انگریزی خطبات کا مطالعہ کیا بعض نکات کچھ صاف ہو گئے مگر کچھ ابھی باقی ہیں۔ اس پر فرمایا کہ نہیں۔ جو آپ کہتے ہیں کہ صاف ہو گئے ہیں وہ بھی صاف نہیں ہوئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ انسان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتا فلسفے کا کام تو یہ ہے کہ آج چند شاہدات پر بنیاد رکھ کر ایک (CONCEPT) خیال قائم کیا جاتا ہے جو یقینی نہیں بلکہ صرف (RLAUSIBLE ممکن) ہوتا ہے۔ کل احوال مختلف ہو جاتا ہے۔ نقطۂ نظر بدل جاتا ہے تو ایک دوسرا (CONCEPT) قائم کرنا پڑتا ہے اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ انسان بڑھتا چلا جاتا ہے مگر کسی منزل تک نہیں پہنچتا۔ اگر فلسفہ انسان کی تسکین کر سکتا تو مذہب کی ضرورت ہی نہ ہوتی اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے مذہب کا وجود ہے (RELIGIUS EXPERIENCE حاسۂ مذہبی) کم از کم فرد کی تسکین ضرور کر دیتا ہے۔ ہمارے صوفیائے کرام نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ یہ حاسۂ مذہبی معانقہ و توجہ سے ایک فرد سے دوسرے فرد میں منتقل کیا جائے۔ بالخصوص نقشبندیہ اور مجددیہ سلسلے کو اس میں کامیابی بھی ہوئی ہے میں نے پوچھا۔ یہ آپ محض منقولات پر اعتبار کرتے ہوئے فرما رہے ہیں یا تجربۃً درست سمجھتے ہیں؟ بولے کہ ان کی صحت میں مجھے بالکل شک نہیں۔ البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہوتا کیونکر ہے ممکن ہے کہ علم نفسیات ترقی کر کے اس راز کو سمجھنے کے قابل ہو سکے۔

میں نے سوال کیا کہ آخر اس حاسۂ مذہبی کے حصول کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ بولے آپ نے کون سا امتحان پاس کیا ہے؟ میں نے کہا بی۔ اے کا بولے کہ اس کے لئے کتنا وقت صرف کیا؟ میں نے کہا چودہ برس کہنے لگے تو کم از کم کچھ سال تو اس طرف بھی لگائیے یونہی کیونکر حاصل ہو سکے؟ میں نے کہا یہ تو بیشک درست ہے مگر ایسے شخص نظر نہیں آتے جو رہنمائی کر سکیں۔ آپ نے خود بھی تو صوفی کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ ؎

خبر منزل لیسلے نہ تو داری و نہ من

مسکرا کر کہنے لگے کہ یہ من حیث الجماعت لکھا گیا ہے اور واقعی اس وقت صوفیہ کا یہی حال ہے۔

غیر معمولی انسان

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ (GENIUS) (غیر معمولی انسان) ہر زمانے میں موجود ہوتے ہیں کبھی زیادہ اور کبھی کم۔ آجکل بھی ایسے شخص ضرور ہوں گے۔ اور ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب جماعت رو بہ ترقی ہوتی ہے تو اس میں بکثرت (GENIUS) پیدا ہوتے ہیں۔ اور انحطاط کے زمانے میں کم۔ ترقی پذیر جماعتوں میں اگر ایک غیر معمولی انسان اٹھ جاتا ہے تو فوراً اس کی جگہ پر کرنے کو دوسرا پیدا ہو جاتا ہے لیکن رو بہ انحطاط جماعت میں ایک (GENIUS) اٹھ جانے

ہوئے۔ بولے مولانا یہ وہی آپ کی رباعی[لہ] والا مضمون ہے ع

تفسیر نے قرآن کو چھپا رکھا ہے

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے بہترین ذریعہ اپنا ضمیر ہے۔ اس کے متعلق مجھے اپنے والد مرحوم کا قول یاد ہے بلکہ اسی قول نے میری زندگی پر بہت کچھ اثر بھی ڈالا۔ واقعہ یوں ہے کہ میں ابھی سکول میں تھا یا کالج کی پہلی جماعت میں جب ایک صبح والد مرحوم میرے کمرے میں آئے میں حسب معمول قرآن شریف کی رسمی تلاوت کر رہا تھا۔ پوچھنے لگے کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ میں حیران تھا کہ آخر اس سوال سے کیا مطلب ہے جبکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ میں قرآن پڑھ رہا ہوں۔ میں نے کہا قرآن پڑھ رہا ہوں۔ کہنے لگے ہاں مگر قرآن شریف میں کیا پڑھ رہے ہو؟ کچھ سمجھتے بھی ہو یا یونہی پڑھتے چلے جاتے ہو؟ میں نے کہا۔ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں اور کچھ نہ کچھ مطلب بھی سمجھتا ہوں۔ بولے نہیں۔ قرآن شریف کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک یہ اسی طرح نازل نہ ہو جیسے رسول اللہ پر نازل ہوا تھا۔" میں یہ سنکر متعجب ہوا کیونکہ میں اس فقرے کا مفہوم پوری طرح نہ سمجھ سکا۔ لیکن یہ فقرہ میرے دماغ میں چکر لگاتا رہا اور ایک عرصہ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ واقعی اس میں ایک بڑی رمز پنہاں ہے اور اب تو میں اسکی صداقت کا پوری پوری طرح قائل ہوں۔ یہی نقطہ خیال میری زندگی پر بہت کچھ اثر انداز بھی ہوا ہے۔ واقعی انسان کے ضمیر کی نشوونما اس قدر ہونی چاہیئے کہ وہ قرآن شریف کی حقیقت کو اسی طرح سمجھے جس طرح آنحضرت صلعم محسوس فرماتے تھے اور ایسا معلوم ہو کہ قرآن براہِ راست نازل ہو رہا ہے۔

[لہ] اس ملاقات سے چند روز پہلے کسی اور مجلس میں اخگرؔ صاحب نے کچھ رباعیاں سنائی تھیں۔ جن کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ اب اس کا مزید ثبوت یہ ملا کہ رباعی ڈاکٹر صاحب کو یاد رہ گئی تھی۔

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) **طلوعِ اسلام** ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہوتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک دیجئے۔ ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ تاریخ سے پہلے آنی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہو جاتا ہے اس مہینے کے پرچے کے اندر ایک اطلاعی جوابی کارڈ رکھ دیا جاتا ہے۔ جواب ایک ہفتہ کے اندر آنا چاہیئے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے اور قیمت فی پرچہ (۸/) چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی۔ پی طلب کر لینے کے بعد اسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جرم سزا دینے کے مترادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھیئے نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمائیے۔

(۹) آپ اپنا تعارف **نمبر خریداری** کے ذریعے سے ہی کرا سکتے ہیں اس لئے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ ہمیں بے حد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) **طلوعِ اسلام** کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ بلکہ ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اس لئے اس سے اشتراکِ عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ واللہ المستعان

(۱۳) نمونے کے پرچے کے لئے ۴، کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں

(۱۴) [illegible] پرچہ [illegible] مل سکے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام دہلی